إنّ من الشعر لحكمةً

شعر و حکمۃ

نیّر واسطی

ملک سراج الدین اینڈ سنز۔ پبلشرز۔ کشمیری بازار۔ لاہور (پاکستان)

إنّ من الشعر لحكمة

شعر و حکمت

نیّر واسطی

بار دوم ——— ۲۰۰۰

آفسٹ ایڈیشن

قیمت ——— ۵ روپے

طابع ——— ملک سراج الدین

مطبوعہ ——— علمی پرنٹنگ پریس لاہور

مقام اشاعت ——— ملک سراج الدین اینڈ سنز
کشمیری بازار لاہور (۸)

میکدہ   حکیم صاحب قبلہ
ترانۂ خلافت   "
اختر دہلوی   "
طب العرب

فہرست

حکایت جنوں (مقدمہ) ٥

محراب حرم

نسیم حجاز ٤٣
ساقی کوثر کے حضور میں ٤٤
طلائی جلوہ گاہ ٤٧
غزل ٥٠
سلام ٥١
پیام عید ٥٢
عید بہار ٥٣
عید اضحیٰ ٥٥
نشاط خودی ٥٨

یاد رفتگاں

اختر ٦٣
بیاد اختر شیرانی ٦٥
قسمت بادہ ٦٦
ایک یاد ٦٧
بزمی کے تابوت کی خبر سن کر ٦٨
بزمی مرحوم کی تربت دیکھ کر ٦٩
مولانا ظفر علی خاں ٧١

تیر نیمکش

خطاب بہ ساقی ٧٥
افسانہ ٧٦
کیف انتظار ٧٨
ایک یاد (بیاد یک جلوۂ فرنگ) ٧٩
ایک یاد (سیف الملوک کی جھیل پر) ٨٠
کاغان کے نظارے ٨١
مری ٨٢
دیار سلمیٰ ٨٧
بار دگر ٨٨
دعوت شوق ٨٩
صبح بہار ٩٠
صبح بنارس ٩١
معرکۂ حسن وعشق ٩٣
پیام حیات ٩٥
مغموم شباب ٩٧
سحر موسیقی ٩٩

اشارات

پیغام سروش ١٠٣
نغمۂ بہار ١٠٤
شرح اشارات ١٠٥
ہائے کراچی ١٠٨
اشاریہ ١١١
بہار استقلال ١١٢
عید بہار ١١٤
حسین بی بی ١١٥

حکایتِ لذیذ

بُتانِ ہند کے نام ۱۱۹
پیامِ شاعرِ پاکستان ۱۲۰
بحضرۂ شیخ الرئیس بو علی سینا ۱۲۱
غزل بعد از معذرت از روحِ حافظؒ ۱۲۲
جوابِ نامہ ۱۲۳
ذکرِ معروفؒ ۱۲۴
آستانہ حسینؓ پر ۱۲۵
بتانِ لبنان ۱۲۶
شامِ دمشق ۱۲۷
نذرِ عقیدت (مولانا محمد علی جوہر کے حضور میں) ۱۲۸
نذر، شہزادی مارگریٹ کے حضور میں ۱۳۰
ایک حادثہ ۱۳۴
بہ پیش گاہِ گونہ بزرگ ۱۳۵
وادیٔ نیل ۱۳۶

شہرِ غزل

حیراں ہے آنکھ چشمِ عنایت کو کیا ہوا ۱۳۹
ہیں ان حسین نظاروں کے پاس آ نہ سکا ۱۴۰
بہارِ صبح نے گل کو رلا کے چھوڑ دیا ۱۴۱
حسرتِ پیہم سے دل تنگ آ گیا ۱۴۲
بادۂ تیری آنکھ کی کرامات ۱۴۳
دل و نظر کے لئے لطفِ ناگہاں بن کر ۱۴۴
کس کی محفل سے لئے کیفِ نظر جاتا ہوں ۱۴۵
میرا سرِ نیاز کہاں تیرا در کہاں ۱۴۶
شبِ سرشک کی اگ یادگار بھی تو نہیں ۱۴۷
رہی فطرت کو اک گل پیرہن کی آرزو برسوں ۱۴۹
تڑپ کر خاک پر جب کروٹیں بسمل بدلتے ہیں ۱۵۰
مجھ کو مسافرت کے مصائب کا غم نہیں ۱۵۱
وا حسرتا کہ آہ و فغاں میں اثر نہیں ۱۵۲
جب نقابِ رخِ زیبا وہ اٹھا لیتے ہیں ۱۵۳
سوادِ زلف پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو ۱۵۴
ہو چکی رسوائے عالم چاک دامانی مری ۱۵۶
پھر ہجر و فراق کی گھڑی ۱۵۷
سوئے رات کو روتے روتے ۱۵۸
پھر وہی ہم وہی تنہائی ہے ۱۵۹
جہانِ تیرہ کی تاریکیاں مٹا کے چلے ۱۶۰
تھکے نہ اہلِ طلب عرضِ مدعا کرتے ۱۶۱
بہارِ باغ رخصت ہو رہی ہے ۱۶۲
آنکھوں میں سمائے جاتے ہیں نیندوں پر چھائے جاتے ہیں ۱۶۳
ادائے خاص سے دیکھا عطائے جام سے پہلے ۱۶۴
پھر چشمِ فلک سوئے گلستاں تو نہیں ہے ۱۶۵
شہر از میر دیکھتا ہوں میں ۱۶۶

مئے باقی

گنبدِ خضرا کے سایہ میں ۱۷۱
نفیرِ عشق ۱۷۲ نالۂ دل ۱۷۳
نغمۂ عشق ۱۷۴ یادِ وطن ۱۷۵
ایک عرب مجاہد کی تصویر دیکھ کر ۱۷۶
علی مسجد میں چند قبائلیوں کو دیکھ کر ۱۷۷
شیں اُن ۱۷۸
ساقیٔ کوثر سے فریاد ۱۷۹
چشمہ اور سمندر ۱۸۰
مرگِ آرزو ۱۸۲
کاکس بازار ۱۸۴
جوابِ مکتوب ۱۸۵ خیر مقدم ۱۸۷
اخبارات کے تبصرے ۱۹۶



حکیم نیّر واسطی (ستارہ خدمت)



حکایتِ جنوں

(۱)

جہاں تک "شعر و حکمت" کے مندرجات کا تعلق ہے ان کے حسن و قبح کی بحث سے مجھے سروکار نہیں۔ یہ کام نقاد یا آنے والے دور کا مؤرخ کرے گا وہ اگر پسند کرے گا تو ان اشعار کو تاریخ ادب اردو میں جگہ دے گا اور اگر چاہے گا تو ان کی یاد کو سبزۂ بیگانہ کی طرح ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

میری زندگی ایک بہت معمولی اور حقیر انسان کی زندگی ہے اور آج تک اس میں کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو سکی جس کی داستان سنانے کے لئے دوسروں کا وقت ضائع کیا جائے لیکن مجھے آپ کو یہ داستان اس لئے سنانا پڑے گی کہ اس "مجموعہ" کا ہر شعر اس داستان کا ایک تشریح طلب حصّہ ہے۔

میری زندگی حوادث و سوانح کا مجموعہ بنی رہی ہے اور اس کتاب کا ہر شعر زندگی کے کسی نہ کسی حادثہ سے وابستہ ہے۔ جب بھی کوئی حادثہ یا سانحہ پیش آیا شعر کی صورت میں مجسّم ہو گیا اور زندگی منظوم صورت میں اسی طرح مرتب ہوتی چلی گئی۔

پھر قطع نظر اس کے جہاں تک نفسِ مصائب و آلام کا تعلق ہے۔ یہ ایسی نئی چیزیں نہیں جو سب کی زندگی میں کم و بیش یکساں طور پر نہ پائی جاتی ہوں ؎

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اور انسانیت کی تاریخ شاہد ہے کہ اگرچہ بالعموم عام انسانوں کی طرح مصائب و نوائب کی صورتیں مختلف نظر آتی ہیں لیکن نوعیت ان سب کی ایک ہی رہتی ہے۔

ابو العلاء المعری نے کیا خوب کہا ہے ؎

وکانت ماھذا الزمان قصیدۃ
ما اضطر شاعرھا الی ایطائھا

پس ہو سکتا ہے کہ حالاتِ زندگی کی یہی یکرنگی یا ہمرنگی آپ کو ان کے مطالعہ کے لئے آمادہ کر سکے۔ علاوہ ازیں یہ زندگی اپنی جگہ بے حد حقیر سہی لیکن اسے ماضی میں شعر و ادب کی چند ایسی عظیم ہستیوں سے نسبتِ خاص رہی ہے جو اپنے دور کے بلند پایہ شاعر اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ شاعری اور علم و ادب کے ایک نئے دور کے بانی بھی تھے ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

اور ہو سکتا ہے کہ یہی "نسبتِ بزرگ" آپ کے لئے وجہِ جاذبیت بن سکے۔

(۲)

بہر کیف میری یا "شعر و حکمت" کے اشعار کی مختصر داستان یوں ہے :-

میں ۱۹۰۱ء سنہ میں یوپی کے ایک قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں واسطی سادات کے خاندان میں پیدا ہوا۔ والد مرحوم سید مظفر حسین جو نگینہ ضلع بجنور میں وکالت کرتے تھے۔ بڑے پاکباز صوفی اور باخدا درویش اور بزرگ تھے۔ ہوش سنبھالا تو ان کی محافلِ حال و قال میں تصوف و عرفان کے ان نغموں سے کان آشنا ہوئے ؎

حسن جب مقتل کی جانب تیغِ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا
بے مروت ناوک افگن آفریں صد آفریں
دل کا دل زخمی کیا پیکاں کا پیکاں لے چلا

دل اس وقت تک "لذتِ پیکاں" سے آشنا نہ تھا کہ نو سال کی عمر میں والد مرحوم کے سایۂ تربیت سے محروم ہو گیا اور اس کے بعد بے درد زمانے نے رفتہ رفتہ وہ تمام سامان فراہم کر دیئے جو ایک ستم رسیدہ اور غم نصیب شاعر کی شاعری کے لئے خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چچا مرحوم نے اب بھتیجے کو قصبے کے ایک اسلامی مدرسے

میں داخل کرا دیا۔ جہاں فارسی کی تعلیم حسب دستور "آمد نامہ" اور "حمد باری" سے شروع ہوئی اور گلستاں بوستاں کی منزلیں طے کرتی ہوئی سکندر نامہ اور شاہنامہ تک پہنچی۔ اور اسی طرح عربی کی تعلیم میزان و منشعب سے شروع ہو کر علوم متداولہ تک جاری رہی۔

فارسی کا ابتدائی درس مولانا امتیاز حسین مرحوم اور عربی کا ابتدائی درس مولانا حامد حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے لیا۔ علوم شرقیہ کے اس ابتدائی درس و مطالعہ اور ان بزرگوں کے فیضِ تربیت کا یہ اثر تھا کہ انہی دنوں میں جب کہ عمر ابھی دس بارہ سال کی تھی شعر گوئی سے یک گونہ وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔

پھر اسی زمانے میں قصبے کے ایک مشہور شاعر جناب سید نقی حیدر صاحب کی زیارت کا موقع میسر آیا جو صاحب دیوان بھی تھے انہیں اپنے اشعار دکھانا شروع کر دیئے۔ یہ اشعار بالعموم ہندی اور فارسی الفاظ کی غلط تراکیب اور بے سروپا اضافات سے مملو ہوتے تھے۔ غزلیں جو اس وقت کہتا۔ ان میں زیادہ تر میر۔ امیر۔ داغ اور ذوق کے خیالات و افکار کی ترجمانی اور زلف۔ ابرو۔ خال وغیرہ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حالانکہ اس وقت دل کو صحیح طور پر نہ دام گیسو کا پتہ تھا اور نہ دانۂ خال کا۔ تا آنکہ آہستہ آہستہ عمر کے ساتھ ساتھ ان لفظوں کے صحیح معنی سمجھ میں آنے لگے۔

ابتدا میں غزلوں سے زیادہ نعتوں کی طرف طبیعت مائل تھی۔ جنہیں میں دادہ دینے والوں کی داد کے صلے میں زیادہ لکھتا اور قصبے کی محافلِ نعت میں جھوم جھوم کر پڑھا کرتا تھا۔ عوام پسند نعتوں کے سلسلے میں اس وقت حضرت اکبر وارثی میرٹھی کے نام کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان سے خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لینا شروع کر دی۔ اس وقت کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جہاں میں رحمۃ اللعالمیں شانِ محمدؐ ہے
زمانے میں رواں دریائے فیضانِ محمدؐ ہے
مہارِ سیرِ محبوبی ہے سُبحَانَ الَّذِی اَسریٰ
خدا جانے بوئے گلہائے شبستانِ محمدؐ ہے

سکندر اور سلیماں ہیں محمدؐ کے غلام اب بھی
کہ بالاتر جہاں میں شوکت و شانِ محمدؐ ہے
خدا کی حکمرانی کے عجب انداز ہیں تبؔر
رواں کونین میں ہر سمت فرمانِ محمدؐ ہے

چونکہ ان دنوں فارسی کا مطالعہ تازہ تھا۔ اور سعدیؒ اور حافظؒ سے جو دلی وابستگی پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ انہی دنوں فارسی زبان میں بھی ایک غزل کہہ ڈالی ؎

جلوہ آرا شد ببالیں مہرِ عالمتابِ من
بختِ من بیدار گشتہ از فسونِ خوابِ من
فتنہ آرائے قیامت شوخیٔ رفتارِ تو
جلوہ پیرائے جناں خونِ دلِ بیتابِ من
سوئے میخانہ بیا اے زاہدِ کوثر فروش
دردِ مخموری نمی دارد شرابِ نابِ من
ساقیٔ سرمست نذرِ آتشِ سیال کرد
خرقہ و سجادۂ من منبر و محرابِ من
تبؔر از کیفِ نگاہِ مستِ او شد فیض یاب
نغمۂ من شعرِ من جامِ شرابِ نابِ من

(۳)

شعر گوئی کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ اچانک ترکوں پر کوہِ ستم ٹوٹا اور علی برادران نے جو پہلے خدمتِ کعبہ کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے خلافت کمیٹی کا علم بلند کر دیا۔ انہی دنوں خلافت کی تحریک کے سلسلے میں مٹھورا میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اور مجھے میرے دوستوں نے ایک دعائیہ نظم پڑھنے کے لئے اسٹیج پر کھڑا کر دیا جو اسی وقت دوستوں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ نظم درج ذیل ہے:۔

اے خداوندِ ازل۔ اے مَلِکِ روزِ جزا
جلوۂ کون و مکاں، روشنیٔ ارض و سما
نارِ نمرود کو گلزار بنایا تو نے
کشتیٔ نوحؑ کو طوفاں سے بچایا تو نے
تو نے مکّے کے ضعیفوں کو توانائی دی
فقر کو شانِ شہنشاہی و دارائی دی
خونِ مظلوم کو پھر اس کا صلہ دے یارب
سرخرو دشتِ سمرنا کو بنا دے یارب
دمِ فریاد ہے دادِ دلِ ناشاد کو آ!
اُمّتِ احمدِ مختار کی امداد کو آ
ناتوانوں کو زمانے میں توانا کر دے
بول دینِ شہِ لولاک کا بالا کر دے

یہ نظم اُس وقت کی کچھ ایسی راگنی تھی کہ اہل جلسہ نے جس میں قصبے کے تمام چھوٹے بڑے لوگوں کا جمِ غفیر ایک جگہ اکٹھا ہوگیا تھا۔ جی بھر کے داد دی اور بابائے خلافت نے بھی کھڑے ہو کر پیٹھ ٹھونکی۔ اس کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر ایک کی نگاہ میں سچ مچ شاعر سمجھا جانے لگا حتیٰ کہ میرے مخالف ساتھیوں کو بھی جو اس سے پہلے مجھے محض تُک بند سمجھتے تھے میرے متعلق اب یہی رائے قائم کرنا پڑی۔

قصبہ یا قصبہ کے گرد و نواح میں اب جہاں کہیں کانگریس یا خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوتا مجھے بالعموم نظم پڑھنے کے لئے طلب کیا جاتا۔ لوگ داد دیتے اور اگرچہ یہ داد میری تعلیم پر بیداد کرتی رہی تاہم مجھے باقاعدہ شاعر ضرور بناتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ترکوں پر اتحادیوں اور ہندوستان پر انگریزوں کے مظالم کے سلسلے میں "ترانۂ خلافت" کے نام سے نظموں کا ایک اچھا خاصا مجموعہ مرتب ہوگیا جو دھام پور ضلع بجنور میں چھپ اور بحق سرکار ضبط ہوگیا کہ ع

آتشے بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت

انہیں دنوں خلافت کمیٹی کے ایک اور جلسے میں ایک نظم پڑھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

آج خالدؓ نہیں، بوذرؓ نہیں، سلمانؓ نہیں،
یوں مسلمان تو لاکھوں ہیں، مسلمان نہیں!
آج بھی دشت میں اونٹوں کی قطاریں ہیں رواں
جس سے رقصاں تھے بیاباں وہ حدی خواں نہیں
دورِ مینا نہ رہا، محفلِ ساقی نہ رہی
اب وہ میخوار نہیں، اب وہ خمستاں نہیں

ان دنوں ملک کے تمام مسلم روزناموں کے پہلے صفحات بالعموم قومی نظموں سے بھرے ہوتے تھے اور قومی شاعروں کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو چکا تھا جن کی نظمیں اس دور کے ایک خاص طرز و انداز کی حامل ہوتیں اور اخبارات میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اسی قبیل کی میری ایک نظم یوں تھی:-

دل کو دردِ عشق سے ذوق آشنا ہونے تو دے
دردِ دل ہونے تو دے، دل کی دوا ہونے تو دے
دل کی دنیا گلستانِ جاوداں بن جائے گی
تو ذرا زخمِ محبت کو ہرا ہونے تو دے
اک نہ اک دن دامنِ گلچیں میں لگ جائے گی آگ
بلبلِ خاموش کو آتش نوا ہونے تو دے
ہر قدم پر تجھ کو ڈھونڈے گی صراطِ مستقیم
دل گرفتارِ خمِ زلفِ دوتا ہونے تو دے
لائے گی تاروں کا سہرا گوندھ کر صبحِ بہار
بزم میں خورشید کو جلوہ نما ہونے تو دے

ایک اور نظم کے چند اشعار اس طرح تھے:-

صلاح الدین بن جائے گا ذرہ ذرہ مشرق کا
ذرا باطل کو حق سے برسرِ پیکار رہنے دو
ہزاروں حشر خوابیدہ ہیں مستقبل کے پہلو میں
نہ چھیڑو داستانِ فتنۂ تاتار رہنے دو
نہ بھولو سوزِ غم کی لذتوں کو خوابِ عشرت میں
ارے او سونے والو! روح کو بیدار رہنے دو

مولانا مظہر الدین مرحوم مدیر "الامان" سے جو اُن دنوں نگینہ سے "دستور" نکالتے تھے اسی سلسلے میں خصوصی نیاز مندی کا شرف حاصل ہو چکا تھا ان کے اخبار میں لارڈ ریڈنگ سابق وائسرائے ہند کے متعلق ایک نظم چھپ گئی جس کا مصرع تھا۔ ؎

دور ہا ہے تجھے رانڈوں کا رنڈاپا ریڈنگ

بعد میں معلوم ہوا کہ اس اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی ؎

ہم جس جگہ گئے وہیں ویرانیاں گئیں

یہاں خلافت اور کانگریس کی اس تحریک کے سلسلے میں جس کے ہنگاموں سے اس وقت غیر منقسم ہندوستان کا ہر گوشہ متاثر تھا۔ یہ عرض کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ اس نے جہاں مسلمانوں میں قومی زندگی اور اس کی تنظیم کی بنیادیں استوار کیں۔ وہاں اردو شعر و ادب اور صحافت کو بھی ایک نئے مدرسۂ فکر کی حیثیت سے ایک نیا ماحول نیا اندازِ نگارش اور نیا طرزِ فکر و نظر عطا کیا۔ شعر و ادب میں ذہن کا اس ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا اور بقدر حوصلہ و طلب ہوا بھی۔ بالخصوص اس لئے کہ ان دنوں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں اور علی برادران سے ایک دلی نسبت پیدا ہو چکی تھی جن کی ہنگامہ خیز تقریروں اور تحریروں سے تمام ملک گونج رہا تھا۔

(۴)

تحریکِ ترکِ موالات اور عام سلسلۂ دار و گیر کا اثر طلباء کے اذہان پر بھی پڑنا لازمی تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک حد تک کہیں کہیں ملک کا تعلیمی نظام کچھ دنوں

کے لئے متزلزل سا ہوگیا تھا۔ میرا سلسلۂ تعلیم اگرچہ کلیتہً معطل تو نہیں ہوا لیکن ان تحریکات میں شمول کے بعد تعلیم کے سلسلے میں ایک طرح کا ذہنی الجھاؤ ضرور پیدا ہوگیا چنانچہ صورت اب یہ ہوگئی کہ کتابیں بغل میں دبائیں اور ہندوستان کے جس مدرسے کی شہرت سنی اسی کی طرف چل پڑے اور اب ایک دن دیوبند میں تھا تو دوسرے دن بریلی میں اور ایک قدم لکھنؤ میں تھا تو دوسرا کانپور اور رامپور میں ۔

ع رہے آوارۂ صحرانوردی کوبکو برسوں

تعلیم کے لئے اس آوارہ گردی کا جو انجام ہونا چاہیئے تھا، ہوا۔ البتہ اس کا ہر ایک خوشگوار نتیجہ ضرور نکلا کہ جگہ جگہ پھر کر ملک کے ان یگانۂ روزگار اکابر علماء، فضلا اور ادبا کی آنکھیں دیکھ آیا جن کی نظیر اب چشم فلک کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ بزم صحافت میں صحافی آ بیٹھیں گے لیکن ابوالکلام اور ظفر علی اب پیدا نہ ہوں گے۔ علماء آئیں گے لیکن شیخ الہند کے روئے انور کی زیارت اب نصیب نہ ہوگی اور قوم کے مخلص لیڈر بھی آتے رہیں گے لیکن حسرت موہانیؒ اور رئیس الاحرار کی مثالیں اب نہیں ملیں گی ؂

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ہاں تو اس تعلیمی آوارہ گردی کے سلسلے میں سب سے پہلے وطن سے نکل کر ۱۹۲۰ء میں دِلّی آیا اور طبیہ کالج میں داخل ہوا۔ دِلّی اُس وقت علم و فضل اور شعر و ادب کے اکابر کا مرکز بنی ہوئی تھی طب اور علوم دینیہ میں حکیم اجمل خاں اور مفتی کفایت اللہ کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا۔ بزم عرفان و تصوف میں خواجہ حسن نظامی کا سجادہ آراستہ تھا اور شاعری میں مولانا وحیدالدین بیخودؔ اور جناب نواب سراج الدین صاحب سائلؔ مرحوم اور ان کے تلامذہ کا طوطی بول رہا تھا اور ان ہی اساتذۂ فن میں فخر دودمانِ دردؔ، حضرت مولانا حکیم ناصر نذیر فراقؔ دہلوی کا نامِ نامی بھی افسانۂ بزم و انجمن تھا جن کی ذات گرامی سے مجھے ارادتِ خصوصی رہی ۔

ماحول اور ان بزرگوں کی نظر کیمیا اثر کی کرامت تھی کہ دِلّی آکر شعر کی آتشِ شوق اور زیادہ تیز ہوگئی اور دوستوں نے جب دیکھا کہ طب کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے

شاعری کا مرض بھی لاحق ہے تو انہوں نے مشاعروں میں بھی کھینچنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے ہندو راؤ کے باڑے کے ایک مشاعرے میں لے جایا گیا جہاں شہر کے اکثر اہل فن جمع تھے۔ یہاں حسب ذیل اشعار پڑھے ؎

کس طرح دیکھے گئے آثارِ دہلی کیا کہوں ؟
دل کا جوشِ حسرت و غم سے عجب عالم ہوا
میکشوں سے ہو گئی خالی بساطِ انجمن
کل جہاں تھے شادیانے اب وہاں ماتم ہوا
تو نے وہ آنسو بھی بلبل کا نہ چھوڑا اے فلک
جو نمایاں برگِ گل پر صورتِ شبنم ہوا
ذرّے ذرّے سے ہوئے آثارِ حسرت آشکار
گوشے گوشے میں بپا ہنگامۂ ماتم ہوا

غالبؔ، ذوقؔ اور میرؔ کی دلی میں ایک نو وارد مسافر کی زبان سے دلّی والوں کے کانوں میں جب دلّی کا مرثیہ پہنچا تو محفلِ مشاعرہ مجلسِ ماتم میں بدل گئی اور ہر طرف کہرام مچ گیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ میں دلّی کے حلقہ شعراء میں متعارف ہونے لگا اور اس کے بعد میں نے جرأت کی اور گاہے گاہے اساتذۂ فن کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کر دیا۔

ایک دن حضرت بیخودؔ کی مجلس میں بیٹھا تھا۔ ایک صاحب نے اصلاح کے لئے غزل پیش کی۔ میں نے بھی دیکھا دیکھی اپنی غزل سامنے رکھ دی۔ آپ نے اس کے ایک شعر میں اس طرح اصلاح فرمائی ؎

اصل۔ جنت الفردوس سمجھے ہو جسے تم زاہدو — یہ کسی حسرت زدہ کے خواب کی تعبیر ہے
اصلاح۔ جنتِ آدم سمجھ رکھا ہے زاہد نے جسے — " " فرقت زدہ " "

دل اب دلّی کے رنگِ تغزل سے ایک حد تک آشنا ہو چلا تھا۔ بعد میں یہ پوری غزل وہاں ایک مشاعرہ میں یوں پڑھی۔ ؎

باغ ہے جوئے رواں ہے، ابر عالمگیر ہے
پھر دلِ توبہ شکن آمادۂ تقصیر ہے
آگ سینے میں لگاتی ہے پپیہے کی پکار
عشق کے دل سوز نغموں میں عجب تاثیر ہے
فصلِ گل اِس بار لائی ہے عجب دورِ جنوں
اب نیا صحرا، نیا زنداں، نئی زنجیر ہے
وہ بدلتے ہیں تو دنیا بھی بدل جاتی ہے ساتھ
ان کے ہاتھوں میں نظامِ گردشِ تقدیر ہے

اور پھر جب بارہ سال کے بعد ایک مرتبہ کشمیر میں اچھابل کے نواح میں مقیم رہ کر لاہور واپس آیا اور مرورِ ایام کے بعد ایک یاد نے تڑپایا تو اس غزل کا مقطع یوں ہوا کہ ؎

ہم نے دیکھی تھی چمن میں نیّر اِک شامِ بہار
آج تک آنکھوں میں حسنِ خطۂ کشمیر ہے

دلّی کے بعد تعلیمی آوارہ گردی لکھنؤ لے گئی۔ یہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک نئی بساطِ سخن آراستہ تھی۔ لکھنؤ اس وقت سنّی اور شیعہ علماء، فضلاء، اطباء، شعرا اور صحافیوں کا ایک عظیم مرکز بنا ہوا تھا اور پرانی تہذیب اور معاشرت جس کے آثار دلّی میں تو بڑی حد تک مٹ چکے تھے، لکھنؤ میں اب بھی ایک حد تک برقرار تھے۔

شہر دیکھا، شہر کی تہذیب اور اس کے لوگ دیکھے لیکن دلّی کے چاندنی چوک کے بعد جب لکھنؤ کا چوک دیکھا تو بے اختیار یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

اگرچہ لکھنؤ دہلی سے لاکھ بہتر ہے!
مگر وہ چوک کہاں، چوک کی بہار کہاں

یہاں یوں تو ہر شخص شاعر تھا لیکن مشاہیر شعرا میں حضرت مرزا محمد ہادی عزیزؔ، بیخودؔ موہانی اور حضرت ثاقبؔ کا نام افسانۂ بزم و انجمن تھا اور باہر سے جو ممتاز شعرا لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گئے تھے ان میں حضرت صفدرؔ مرزاپوری شعری اور ادبی حلقوں میں بالعموم متعارف تھے۔

یہاں بھی دلی کی طرح ارباب علم وفضل اور مشہور شعراء کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے فیض یاب ہونے کا شوق بدستور قائم رہا۔ کئی بار حضرت عزیز مرحوم کو غزلیں دکھانے کا اتفاق ہوا اور کوشش کرتا رہا کہ لکھنؤ کے مدرسۂ فکر سے بیش از بیش استفادہ کروں۔

ایک مرتبہ سعادت گنج (لکھنؤ) کے ایک مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی کہ ؎

زندگی جب وقفِ آزارِ مصیبت ہو گئی — ہر مصیبت دل کو اک پیغامِ راحت ہو گئی
رنگ لایا حسنِ اندازِ بیاں آخر مرا — ہر ادائے حسن میں پیدا لطافت ہو گئی
جھوم کر برسا گلستاں پر سحابِ رنگ و بو — ہر کلی کھل کر بہارستانِ فطرت ہو گئی
اہلِ گلشن کو نہ آئی یادِ یارانِ قفس — فصلِ گل آئی چمن میں اور رخصت ہو گئی

ہم نے دیکھا رات کو اک مہرباں کا جمال
آج نیترؔ خواب میں بیدار قسمت ہو گئی

اس مشاعرہ میں لڈن صاحب بہار کے تلامذہ کے علاوہ خاصی تعداد میں لکھنؤ کے اہل فن جمع تھے۔ غزل حسنِ اتفاق سے پسند خاطرِ احباب ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت عشرت لکھنوی کے زیر اہتمام مشاعرہ تھا جس میں طویل بحر میں ایک غزل پڑھی۔ اس کے بعض اشعار اس طرح تھے ؎

ہر پھول باغِ دہر کا رنگِ وفا نادیدہ ہے
لالے کے دل میں داغ ہے گل خون میں غلطیدہ ہے،

اے شوخیٔ موجِ صبا یہ دل لگی اچھی نہیں
غنچے ابھی مخمور ہیں، سبزہ ابھی خوابیدہ ہے،

غم کی اندھیری رات ہے چھائی ہے نیترؔ بے کسی
میں غمزدہ بیدار ہوں قسمت مری خوابیدہ ہے

ایک دن حضرت صفدر مرزا پوری کے زیر صدارت مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

پھر وہی شب وہی تنہائی ہے
جس کا ڈر تھا وہی رات آئی ہے

یہی وہ مشاعرہ تھا جس میں حضرت صفا آمرزاپوری کا یہ یادگار شعر ہوا تھا کہ ؎

مسکراتے ہوئے وہ آتے ہیں
میرے پھولوں میں بہار آئی ہے

لکھنؤ میں طب کی تکمیل میں نے "تکمیل الطب کالج" سے کی تھی۔ یہاں ایک طبی اجتماع میں جس میں اطبا، کے علاوہ اہل فن حضرات بھی جمع تھے، حسب ذیل نظم پڑھی ؎

کعبے کی سمت سے اٹھا ابرِ نشاط بارِ طب
بن گئی دولتِ عجم میکدۂ بہارِ طب
بزم مہ و ستارہ ہے محرمِ جلوہ زارِ طب
یاد ہے جس کو رونقِ انجمن بہارِ طب
بادہ ہے بادۂ عرب جام ہے جامِ بُوعلی
جس پہ ہے قدسیوں کو رشک ہیں ہوں وہ بادہ خوارِ طب
حلقہ کناں تھے چار سُو خاکِ عرب کے جبّہ پوش
بزم تھی اور بزم میں ساقیِ نو بہارِ طب
پھول کھلے دمشق میں مصر بنا چمن کدہ
خاکِ حجاز سے ہوئی رونقِ لالہ زارِ طب
صبحِ بہار قرطبہ طب کا جمالِ دلفروز
شام کی شامِ جانفزا گیسوئے مشکبارِ طب
گوہر شاہوارِ طب رازی و شیخ کا ہنر
رازی و شیخ کا ہنر گوہر شاہوارِ طب

(۵)

قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ کوچہ گردی کا شوق ہندوستان میں مجھے جگہ جگہ لئے پھرتا رہا۔ اس آوارہ گردی میں کوئے بتاں کی سیر بھی کی اور بریلی لکھنؤ اور دیوبند کے علم و عرفان کے معبدوں کا طواف بھی کیا۔ ؎ درکفِ جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق

گنگ وجمن کی وادیوں اور مہوشانِ اودھ کی گلیوں کی داستانیں آج بھی دل کو کچھ اس طرح یاد ہیں کہ ؎

کیفِ بہارِ وادیٔ گنگ وجمن نہ پوچھ
نسیمؔ کہیں وہ کیفِ بہار نظر نہیں

اور ؎

بیادِ شامِ شبستانِ مہوشانِ اودھ
سحابِ گریہ سے اب تک ستارہ بار ہوں میں

اور پھر جب تاجدارانِ مملکتِ فضل وکمال اور عرش نشینانِ مجد وشرف کے حضور میں سرِ عقیدت ونیاز جھکانے کا موقع ملا تو سرِ عشق پیشہ نے اس سرکار میں بھی متاعِ دل لٹانے میں کمی نہیں کی۔

دیوبند پہنچا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ فیض اثر کے حضور میں یہ نعتیہ اشعار پیش کرنے کی جرأت کی جو بعد میں ذرا تغیر کے ساتھ "الرشید" میں بھی شائع ہوئے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے خوشا لذتِ پیغام تو سبحان اللہ
اللہ اللہ مئے الہامِ تو سبحان اللہ
از فیوضِ کرمت گلشنِ ہستی شاداب
بارک اللہ چہ انعامِ تو سبحان اللہ
رنگ وبوئے عجمی حسن وجمالِ عربی
نوبہارِ رخِ گلفامِ تو سبحان اللہ
داغِ عصیانِ من خوار عیاذاً باللہ
بارشِ رحمت وانعامِ تو سبحان اللہ
تا ہنوز از گل وگلزار مدینہ آید
نکہتِ زلفِ سیاہ فامِ تو سبحان اللہ

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جہاں اس صدی کے بہت بڑے محدث، فقیہہ اور صحیح معنیٰ میں عالمِ باعمل اور عارف باللہ بزرگ تھے وہاں شعر و سخن کا بھی بہت بلند ذوق رکھتے تھے اور جن لوگوں نے آپ کے وہ مراثی پڑھے ہیں جو آپ نے حضرت محدّث گنگوہی قدس سرہ العزیز کی وفات پر لکھے ان کو اس کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔

بریلی پہنچا تو حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ بریلوی کی محفلِ نعت میں ایک مرتبہ یہ نوائے درود و سلام بلند کی ؎

یا رسولَ اللہ · یا شمس الضحیٰ · بدر الدجیٰ
یا حبیبَ اللہ یا نورِ الہدیٰ · کہف الوریٰ
اَے پیامِ رحمتِ حق، صاحبِ خُلقِ عظیم
اَے کریمؐ اے مظہرِ شانِ خداوندِ کریم
اے بہارِ جانفزا، شانِ عرب آنِ عجم
بوئے بستانِ عرب، رنگِ گلستانِ عجم
صدرِ بزمِ انبیائے اوّلین و آخریں
زینتِ فرشِ زمیں، آرائشِ چرخِ بریں
ابنِ مریمؑ کی بشارت ابنِ آذر کی دعا
قلبِ موسیٰؑ کی تجلی، چشمِ آدمؑ کی ضیا
دہر میں باقی رہے جب تک بزمِ ہستی کا نظام
ذاتِ اقدس پر ہزاروں رحمتیں لاکھوں سلام

اور لکھنؤ گیا تو مجلس عزا میں یوں نوحہ خواں ہوا کہ ؎

بوئے دامانِ امام الشہدا آتی ہے — پھول برساتی ہوئی بادِ صبا آتی ہے!
شب کو جب خیمۂ زینبؓ میں ہوا آتی ہے — دلِ زہراؓ کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
غمِ شبیرؓ میں اشکوں کا لئے سیل رواں — سمتِ کعبہ سے سیہ پوش گھٹا آتی ہے
دھوم تھی جنتِ رضواں میں کہ پیاسے آئے — جامِ کوثر کے چھلکنے کی صدا آتی ہے

سبز و شاداب رہے گا یہ گلستاں نیّر
کہ ہر اک آنکھ لیے آبِ بقا آتی ہے

(۶)

میری شعر گوئی کا تیسرا دور لاہور سے شروع ہوا اور درحقیقت یہی وہ دور ہے جس میں دل و دماغ نے ایک نیا طرزِ فکر اختیار کرنے کی کوشش کی۔

اس انتخابِ ہفت کشور میں ۱۹۲۵ء میں وارد ہوا اور پھر اس خاک سے کچھ ایسی والہانہ محبت ہوئی کہ بس اسی کا ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء سے لے کر آج تک اس سی و پنج (۳۵) سالہ دور کی داستان جس میں عمر کا سب سے قیمتی حصہ بسر ہوا ایک ضخیم کتاب چاہتی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ صرف وہ چند امور بیان کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے شعر و سخن کے سلسلے میں میرے ذہن کو متاثر کیا۔

لاہور آ کر جب چونہ منڈی میں مطب شروع کیا تو یہاں بھی آتے ہی حسبِ عادت اربابِ فن کی جستجو شروع کر دی۔

اقبالؒ اور ظفر علیؒ لاہور کی وہ عظیم ادبی شخصیتیں تھیں جن سے یہاں کا ہر چھوٹا بڑا متاثر تھا اور بلاشبہ ابتداءً مجھے بھی یہاں شعر و ادب کی جن سب سے زیادہ بلند اور مشہور شخصیتوں نے متاثر کیا وہ درحقیقت یہی دو عظمتیں تھیں۔

"شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" پڑھ کر بچپن ہی سے علامہ اقبالؒ کی ذات سے عقیدت تھی۔ جن دنوں میں اپنے وطن میں تھا اکثر ان کو خط لکھتا اور مرحوم بڑی محبت سے ان کا جواب دیتے۔ لاہور آیا تو متعدد بار خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک دن ایک طبی اجتماع میں تشریف لائے تو میں نے "نشاطِ خودی" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جو اس مجموعے میں کسی جگہ درج ہے۔ فرمانے لگے کہ طبیب سے زیادہ خار و گل کی زبان کا رازدار اور کون ہو سکتا ہے اور پھر فرمایا کہ خودی کے بے شمار مؤثراتِ فکری میں سے طبیب کی خودی خودشناسی اور اس کا استغنا اس کے علم و فن کی معراج ہے۔

شعر و ادب میں علامہ اقبالؒ کے بعد مولانا ظفر علی خاں مرحوم سب سے زیادہ میری عقیدت و ارادت کا مرجع تھے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب سے آنکھ کھولی تو علی برادران

اور مولانا ابوالکلام کے بعد چوتھا نام جو کانوں میں گونجا وہ ظفر علی خاں کا تھا۔ لہٰذا لاہور کے قیام کے بعد ظفر علی خاں اور ان کے زمیندار سے جس طرح کی نیاز مندی اور عقیدت کا رشتہ قائم ہونا چاہیئے تھا، ہوا۔

قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ میرے فکرِ شعر کی ابتداء نعت سے ہوئی تھی اور نعت کے سلسلے میں امیر مینائی، مولانا حالی، حضرت بیان ؔ یزدانی، اکبر وارثی، دتو رام کوثری، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حضرت حسن بریلوی اور محسن کاکوروی کی نعتوں کے متعدد انداز اور اسالیب نگاہوں سے گزر چکے تھے لیکن نعت میں ظفر علی خاں کی ندرتِ بیان اور والہانہ طرز ادا نے بے حد متاثر کیا۔ میرا ایمان ہے کہ ؎

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

ظفر علی خاں کی بخشش کے لئے کافی ہے۔

مولانا کی نعت کے اس انداز کا ثمر یہ تھا کہ اس رنگ میں نعتیں کہنے کی کوشش کی "نسیم حجاز" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اس مجموعے کی ابتدا میں درج ہے۔ لاہور آنے کے بعد بہت ابتدائی دنوں میں ایک مرتبہ دلی دروازہ کے باہر غازی عبدالرحمٰن امرتسری کے زیرِ صدارت ایک جلسے میں مولانا تشریف فرما تھے۔ جب میں نے اس میں یہ نظم پڑھی تو آپ بے حد مسرور ہوئے۔ مولانا اور زمیندار سے عقیدت کا نتیجہ یہ تھا کہ زمیندار کے لئے مختلف ناموں اور عنوانوں سے قومی نظمیں لکھتا رہا اور زمیندار جس قسم کی بھی سیاسی و ملی تحریکات میں شامل ہوا میں بھی عموماً ان میں حصہ لیتا رہا۔ امان اللہ خاں کے خلاف جب بچہ سقہ نے علمِ بغاوت بلند کیا تو اس وقت ایک نظم کہی جس کے دو شعر یہ تھے ؎

اے وہ کہ تجھ پہ فخر ہے سقوں کی ذات کو
اسلامیوں کا خونِ شہادت بہائے جا
اسلام کے شرف کو نصاریٰ کے ہاتھ بیچ
نقشِ عروجِ ملتِ بیضا مٹائے جا

"الہلال" کا دورِ اولیں اس وقت ملک کے تمام مسلم ذہن پر چھایا ہوا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس دور کے تقریباً ہر ادیب اور صحافی کے لئے ادیب اور صحافی بننے سے پہلے "ابوالکلامیات" کا مطالعہ ایک حد تک ضروری سمجھا جاتا تھا۔

"الہلال" کے بعد دوسرا مکتبِ فکر زمیندار تھا جو ملک کے تمامتر قومی ذہن پر مستولی تھا۔ انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ خاک و خون میں تڑپتے ہوئے مجاہد کی ایک تصویر "الہلال" میں شائع ہوئی۔ یہ تصویر اتنی اثر انگیز تھی کہ اسے دیکھتے ہی طبیعت بیقرار ہو گئی اور یہ بیقراری ایک نظم کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئی۔ یہ نظم اس مجموعہ میں "محراب حرم" کے زیر عنوان کسی جگہ درج ہے۔

(۷)

لاہور کی اس تمام تر زندگی کے سلسلے میں جو ۱۹۲۵ء سے لے کر آج تک بسر ہوئی ایک اور چیز جس کا بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس دور میں آنکھوں نے سیاست والوں میں سے سر شفیع اور سر فضل حسین کا دورِ دولت و اقبال بھی دیکھا اور سر سکندر کا زمانۂ عروج اور سر خضر کا وقتِ زوال بھی۔ اور آخر میں قیام پاکستان کے بعد ان ہی کی ذریات کا عہدِ جنگ و جدال بھی۔ لیکن دل کبھی ان اربابِ مناصب و اقتدار کے قریب جانے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آنکھیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام، مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی، اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ چکی تھیں اور اب جو دل فقیروں کی قدر ہو چکا تھا وہ ان شاہوں کے حضور میں پیش ہونے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ دل میں ایک قناعت سی پیدا ہو گئی تھی اور اربابِ دولت و اقتدار کی صحبت سے بالعموم علیحدہ رہنے کی کوشش کرتا کہ ؎

خوشا درویشیا کو را بود گنجِ تنِ آسانی
مدا سلطانیا کو را بود رنجِ تنِ آسانی

لہٰذا اربابِ دولت سے دور تمام زندگی بالعموم تین قسم کے حلقہ ہائے احباب و رفقاء میں بسر ہوئی۔ مریضوں اور طبیبوں کے ساتھ شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ اور

علما، اور ارباب تصوف و عرفان کے ساتھ۔

جہاں تک مریضوں اور طبیبوں کا تعلق ہے ان کا ذکر یہاں خارج از بحث ہے۔ علما، اور اہل تصوف کے سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ یہاں تقریباً ہر مذہب اور نقطۂ خیال کے بزرگوں اور اہل علم سے رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن سب سے زیادہ جس بزرگ شخصیت نے متاثر کیا وہ حضرت میاں شیر محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی جو ان دنوں لاہور سے بیس میل دور شرقپور میں سجادۂ فقر پر متمکن تھے۔

افسوس ہے کہ حضرت میاں صاحبؒ سے رابطۂ نیاز و ارادت ان کی آخر عمر میں قائم ہوا۔ اور بہت تھوڑے دن قائم رہا۔ لیکن ان کا قلیل بھی میرے لئے کثیر تھا۔ وَلِلّٰہِ دَرُّ مَا قَال۔

قَلِیلٌ مِنْکَ یَکْفِیْنِی وَلٰکِنْ
قَلِیْلُکَ لَایُقَالُ لَہَا قَلِیْل

یہ داستان فی الحال یہیں ختم کرتا ہوں کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

۱۹۲۸ء میں میاں صاحبؒ کا وصال ہوا تو یہ شعر لکھے ؎

لوگ کہتے ہیں ہوا شیرِ محمدؒ کا وصال
اٹھ گئے گویا ابو ذرؓ ہو گئے رخصت بلالؓ
امتِ مرحوم کے ماتم میں اب روئے گا کون؟
داغہائے معصیت دامن سے اب دھوئے گا کون؟
اب یہ شکلیں پھر نہ دکھلائے گی دنیا دیکھ لو!
عاشقِ روئے نبیؐ کی شکلِ زیبا دیکھ لو!
اے زمینِ شرقپور! اے شیرِ ملت کی کچھار
دفن ہوتا ہے تری مٹی میں شیرِ کردگار

ہے دعا نیرؔ کی یہ سے تجھ پہ بدلی نور کی
ہو ہمیشہ تجھ پہ نور افشاں تجلّی طور کی

اور پھر ان ہی دنوں جب حکیم اجمل خاں مرحوم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو عربی زبان میں چند اشعار اس طرح ہو گئے جن کا آزاد منظوم ترجمہ بھی ساتھ درج ہے ؎

یا معشرَ الاخوانِ ابکوا مُبکیاً
دوستو سوزِ جدائی میں کرو ماتم بپا

خسفت بدور کمال شیخ السینا
یک بیک گہنا گیا بدرِ کمالِ بوعلیؔ

مات المسیح فموتہ موت الوریٰ
اب کہاں وہ جس کی نباضی تھی پیغامِ شفا

این الطبیب بطبہٖ یشفینا
موت اک عالم کی ہے رحلت مسیح الملک کی

فی غمہٖ لنا العین عینٌ جاریہ
ماتمِ اجمل میں چشمے چشم سے جاری ہوئے

عنہا یسیل دم القلوب متینا
جن سے نہریں ہیں رواں خونِ دلِ بیتاب کی

قد سکنت عطشا فنعم الجاریہ
ذرّہ ذرّہ کی زباں پر تھی صدائے العطش

ھی عن شراب دموعنا تسقینا
بادۂ خونناب دل نے بجھا دی تشنگی

میرے پہلے مجموعۂ اشعار "میکدہ" میں جو ۱۹۳۱ء میں طبع ہوا تھا یہ تمام نظمیں جزوی تغیرات کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔

(۸)

یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ اسی اثنا میں حضرت اختر شیرانی سے عمیق تعلقات قائم ہونے لگے اور درحقیقت شعر و سخن سے میری وابستگی کا ایک نیا دور اسی وقت سے شروع ہوا۔ اختر سے تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۶ء سے ہی ہو گئی تھی اور وہ اس طرح کہ حافظ محمد عالم مرحوم ان دنوں لاہور سے "عالمگیر" نکالتے تھے جس کے لئے وہ ایسے مستقل شاعروں کی جستجو میں تھے جو ان کی فراہم کردہ تصویروں پر نظمیں لکھیں اور اتفاق یہ ہوا کہ حافظ صاحب نے اس مقصد کے لئے مجھے اور اختر شیرانی مرحوم کو منتخب کر لیا اور اب صورت یہ تھی کہ اس وقت تک میں اور اختر دونوں اگرچہ ایک دوسرے کے صورت آشنا نہ تھے لیکن اس طرح کی نظم نویسی کے سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ایک

طرح کے مقابلے کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور بعض لوگ شاید مصلحتاً اس آگ کو اور زیادہ ہوا دیتے تھے۔ "شعر و حکمت"، "کیتی ہیمکش" کی چار نظمیں" "بیوہ کے آنسو" "حسن خوں آشام" "محبت کا اولیں لمحہ" اور "سحر موسیقی" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور اختر کے کلام ہیں" "جوگن" "انجام ہستی" "تیتری" وغیرہ بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ یہ صورت جاری تھی کہ اسی اثنا میں حضرت عاشق بٹالوی نے اختر کی شاعرانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے انداز میں آکر بیان کئے کہ جذبۂ مسابقت کی جگہ اختر سے ملاقات کا شوق روز بروز بڑھتا گیا اور ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ آپ میرے مطب چونہ منڈی لاہور میں شام کے وقت بلا اطلاع خود بخود تشریف لے آئے۔ تقریبِ ملاقات غالباً یہ تھی کہ مرحوم مجھے میر نور احمد صاحب کے یہاں علاج کے سلسلے میں لے جانا چاہتے تھے۔

اختر شیرانی سے ملاقات کی یہ پہلی شام تھی۔ اس کے بعد جو دن آیا ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لاتا گیا تا آنکہ اختر اپنی زندگی کے آخری دن بھی میرے ہی غربت کدہ سے رخصت ہوئے۔

زندگی کا اب یہ ایک معمول بن چکا تھا کہ روزانہ شام کو تانگہ لیا اور فلیمنگ روڈ پر حضرت اختر کے مکان پر پہنچ گیا اور اکثر ایسا ہوتا کہ اختر مرحوم اسی تانگہ میں بیٹھ جاتے اور منٹو پارک یا لارنس گارڈن میں لے جاتے اور باتیں کرتے رہتے۔ ان باتوں میں جہاں بہت سی بے ربط باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں شعر و شاعری کے سلسلے میں کام کی باتیں بھی ہونے لگتی تھیں۔

اس کے بعد اختر کے ساتھ مراسم نیاز کا سلسلہ زندگی بھر قائم رہا اور ان کی تمام زندگی بالخصوص ان کی رومانی زندگی کے تقریباً تمام مراحل و ادوار ان آنکھوں کے سامنے گزرے۔ گجرات کی رات کی جلوہ باریاں۔ ایبٹ آباد کی شام وداع کی نالہ سامانیوں مری کی صنوبرستانی فضا کی بہار فروشیوں اور خصوصیت کے ساتھ باغ لارنس کی چاندنی راتوں کی محفلوں میں سے کوئی محفلِ رنگ و بو ایسی نہ تھی جس سے یک گونہ وابستگی نہ رہی ہو۔

اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور اختر صاحب کہنے پر اکثر مجھ سے ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ مجھے صرف اختر کہا کیجیے۔ ساتھ ہی انہیں اس قدر پاس خاطر یا لحاظ بھی تھا کہ جب

اپنے شغلِ خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سن پاتے تو بوتل کو (جسے وہ دخترِ گردن دراز کہا کرتے تھے) اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش فرماتے۔ بایں ہمہ لطف یہ تھا کہ مجھ سے بلا تکلف اپنا ہر دکھ درد بیان ہوتا اور عشق و عاشقی کے تمام افسانے سنائے جاتے تھے کسی کوچے میں کوئی الہام نکل آتا تو بالعموم مجھ سے اس کا تذکرہ ہوتا اور اکثر ان "اہم امور" میں مجھ سے مشورہ لینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن آہ اس وقت کسے خبر تھی ؎

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مختصر یہ کہ ان کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے اکثر لمحات میرے ساتھ بسر ہوئے اور وہ بیشتر سوانح اور حوادث جو سلمیٰ کے عشق اور ان کی رومانی زندگی میں ان کی نظموں کے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں آنکھوں کے سامنے گزرے۔

عروس البلاد لاہور اس دور میں شعر و ادب کے بلند پایہ اکابر علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا اور گاہے گاہے ان میں سے اکثر ارباب فضل و کمال سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن مطب کی مصروفیتوں کی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضری کا بہت کم اتفاق ہوتا اور شہر کے مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتا۔ اختر کی خلوت ہی اپنے لئے ایک مستقل محفل بن چکی تھی اور ہمیشہ یوں محسوس کرتا کہ ؎

بہت لگتا ہے جی محفل میں ان کی
وہ اپنی ذات سے خود انجمن ہیں

آخر میں اکثر شام کے وقت ایسا ہوتا کہ وہ جھومتے جھامتے آجاتے اور رات کو دیر تک بیٹھے اپنی باتوں سے مجلسِ خلوت کو باغ و بہارِ شعر بنائے رہتے تھے اور ہماری محفل مشاعرہ یا معراجِ سخن اب صرف اس قدر ہوتی کہ جو کچھ کہا ہوتا دوست کو سنا دیتے اور اس کے بعد اسے نذرِ طاقِ نسیاں کر دیتے۔

اختر کی اکثر نظموں کا پس منظر میں اپنی کتاب "اختر و سلمیٰ" میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ایسے ایک دو واقعات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو اختر کی صحبت میں

چند خاص حالات کے زیر اثر غزل بن گئے۔

اختر کے تمام دوستوں کو معلوم ہے کہ وہ بلا کے بادہ کش تھے اور اس کے لئے دوستوں کے ساتھ ان کا حسنِ طلب بہت خاص قسم کا ہُوا کرتا تھا۔ ایک دن تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ دل کی گرمی کا علاج چاہتا ہوں ہوں عرض کیا کہ ٹھنڈائی پیجئے۔ فرمانے لگے علاج بالمثل کروں گا اور اسی وقت میں نے باتوں باتوں میں اس طرح ایک شعر موزوں کر کے ان کو سنا دیا کہ ؎

میں ہانیمن کی طب کا نہ تھا معتقد مگر
مے سے نہ دل کی آگ بجھاؤں تو کیا کروں

مرحوم کو یہ شعر بہت پسند آیا اور اگلے دن جب وہ دوبارہ تشریف لائے تو میں نے اس طرح میں ایک مختصر سی غزل کہہ کر انہیں یوں سنا دی ؎

جب حسنِ التفات نہ پاؤں تو کیا کروں
پھر اک فریب اور نہ کھاؤں تو کیا کروں
اپنی وفا کی یاد میں کھویا ہوا ہوں میں
ان کی جفا کو بھول نہ جاؤں تو کیا کروں
دنیا سیاہ خانۂ اندوہ و غم ہے آج
میں شمعِ آرزو نہ جلاؤں تو کیا کروں
میں ہانیمن کی طب کا نہ تھا معتقد مگر
مے سے نہ دل کی آگ بجھاؤں تو کیا کروں
نیّر وفورِ ضبط سے گھٹنے لگا ہے دم
اے چارہ گر! میں شعر نہ گاؤں تو کیا کروں

ایک دن ان کے ساتھ ایک خاص کوچے سے گذر ہُوا تو ایک غزل اس طرح ہو گئی ؎

کتنے اعلائے پیام ہوتے ہیں — جب وہ بالائے بام ہوتے ہیں
فتنے بڑھتے ہیں چومنے کو قدم — جب وہ محوِ خرام ہوتے ہیں

جرمِ عصیاں کنارِ راوی پر — غرقِ مینا و جام ہوتے ہیں
درِ ساقی پہ شب کو وقفِ سجود — مسجدوں کے امام ہوتے ہیں
برہمن زادگانِ کشمیری — بڑی مشکل سے رام ہوتے ہیں
اُن کے وعدے نہ پوچھ اے نیّر
روز و شب صبح و شام ہوتے ہیں

(۹)

شعر گوئی کا مذاق اب تک گلشنِ ہند کی بہت سی بہاریں دیکھ چکا تھا۔ حمد و نعت کی شاعری سے ابتدا کر کے دلّی والوں کی غزلوں کا ہنر بھی دیکھا اور اہلِ لکھنؤ کی غزل سرائی کا فن بھی اور اس کے بعد جب لاہور آیا تو مولانا ظفر علیؒ کی ہنگامی اور علامہ اقبالؒ کی قومی شاعری کے کمالات سے بھی آگاہی حاصل کرنے کی سعی کی لیکن دل اب ایک نئے اندازِ فکر و نظر کی جستجو میں تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا ساتھی ملے جو اس راہ میں صحیح طور پر رفیقِ سفر یا ہمنا بن سکے۔ آج تک دستور یہ رہا کہ شعر میں حسن کی سرکار کے سوائے کبھی کسی کی مدح سرائی نہیں کی تھی۔ علاوہ ازیں اب لفظی تکلفات اور الفاظ میں فارسی صنائع و بدائع سے دل بڑی حد تک بیزار ہو چکا تھا اور جی چاہتا تھا کہ شعر کو اس کی اصل شکل و صورت میں رکھا جائے اور وہی بات کہی جائے جو اپنے ساتھ گزرے اور محسوس کی جائے اس کے علاوہ ایک اور چیز جو شدت سے دل میں کھٹکتی تھی یہ تھی کہ اردو شاعری ابتدا سے بڑی حد تک قدیم ایرانی شاعری کا عکس بنی رہی ہے اور غالبؔ و ذوقؔ کے بعد اگرچہ اس میں ہندی بھاشا کے الفاظ و تصورات اور گاہے انگریزی ادب کے اندازِ فکر کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود بالخصوص ایک بہت بڑی دولت سے محروم ہے جسے عربوں اور بالخصوص دورِ جاہلیت کے عربوں نے شعر کو عطا کیا۔ یہ تصور میرے نزدیک اس لئے اور زیادہ معنی خیز تھا کہ اردو شعر کی تخلیق میں مسلم اہلِ فن کا بہت بڑا حصہ رہا ہے جو فارسی اور عربی علوم و فنون دونوں سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

بہر کیف یہ فکری عوامل تھے جو اردو شعر کے سلسلے میں دل و دماغ کو ایک نئے ماحول کی

جانب دعوتِ فکر و نظر دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں حضرت اخترؔ شیرانی کی صحبت میسر آگئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اخترؔ اس بارے میں میرے دل کی باتیں کہہ رہے ہیں۔

اخترؔ کی شاعری ایک ایسے رنگین ماحول میں پلنی شروع ہوئی جس میں ان کے شعر کو وہ تمام مواقع میسر آگئے جنہوں نے صحیح معنی میں ان کو اسی دور کی رومانی شاعری کا پیامبر بنا دیا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اس عہد میں اردو شاعری کو وہی متاعِ گراں مایہ عطا کر رہے ہیں جس سے وہ اب تک تقریباً محروم تھی۔ میری مراد عربی تخیل اور بالخصوص شعر میں قدیم عربی فطری اندازِ فکر سے ہے۔

جن لوگوں کو قدرت نے مذاقِ شعر عطا کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک شعر دلآویز سے وہی مقصد حاصل ہوتا ہے جو حسنِ نغمہ اور شراب سے محض لفظی صنائع و بدائع سے ملبوس شعر اس بدصورت عورت کی طرح ہے جو لباس کے اندر تو وہی موجود ہے لیکن باہر سے اسے مخمل و اطلس و کمخواب کی پوشاکوں سے منڈھ دیا گیا ہو۔

اخترؔ کی شاعری نے جہاں محبوبۂ شعر کو لفظوں کی حسین پوشاکوں سے آراستہ کیا وہاں اس نے معنوی حسن و جمال کے انتخاب میں بھی پوری طرح اپنے حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے

بہارِ عالمِ حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را ببو اربابِ معنی را

اخترؔ کی شاعری کے محاسن پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن میرے نزدیک اس کی اصل روح رومان ہے جس کے لئے زبان حافظ کی اختیار کی گئی اور تخیل امرء القیس کا۔ اس کی نظموں میں "صحن میں بنتِ عم کی صداؤں کا تصور" "سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں" وغیرہ چیزیں درحقیقت اسی حقیقت کی ترجمان ہیں۔

بہرکیف ذاتی جستجو اور شوق سے قطع نظر قطعی طور پر کمالِ ہمنشیں کا یہ اثر تھا کہ اب شعر کے سلسلے میں دماغ سے وہ تمام تصورات بڑی حد تک محو ہوتے چلے گئے جو دہلی اور

لکھنؤ نے پیدا کئے تھے اور دماغ اب وہی کچھ سوچنے لگا جو اختر سوچتے تھے لفظوں کے حسین باغ بناتا اور ان میں وہ سب کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا جو ابھی دیکھ چکا ہوتا تھا اور یا پھر تصور میں آرزوؤں کے وہ محل بناتا جن کا آباد کرنا میرے اختیار میں نہ تھا اور اس لئے بالآخر وہ اجڑ گئے۔ آہ ؎

خمیازہ سنج تہمتِ عیشِ رمیدہ ایم
مے آں قدر نبود کہ رنجِ خمار برد

(۱۰)

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا یہ حقیر زندگی بھی بالآخر انہی حسرتوں اور ارمانوں کا شکار ہوئی جن کے داغوں سے ہزاروں سینے لالہ زار بنے اور نذرِ خزاں ہو گئے۔

"در ایامِ جوانی چنانکہ افتد دانی"۔ وہ سب کچھ دیکھا جو دیکھا جا سکتا تھا اور وہ سب کچھ سنا جو سنا جایا کرتا ہے طبیعت ایک طرفہ تماشا تھی کہ سحر اگر تسبیح و مصلیٰ پر بسر ہوتی تو رات اختر کے ساتھ یاد کوئے بتاں میں اور کل اگر کعبہ کی زیارت کے لئے احرام باندھا گیا تو آج بتکدہ کی سیر کی تیاری ہو رہی تھی چنانچہ صورت اب یہ تھی کہ ؎

کل تو مندر میں برہمن کو دیئے تھے درشن
آج مسجد میں مسلمان بنے بیٹھے ہیں

کبھی بہار کے موسم میں جب شام ہوتی تو عالم یہ ہوتا کہ ؎

جلائے وادیٔ غربت میں جگنوؤں کے چراغ
برائے جشنِ بہاراں ہم اور کیا کرتے

اور جب اسی عالم میں آنکھ لگ جاتی تو کیفیت یہ ہوتی کہ ؎

سوئے رات کو روتے روتے
اُٹھ بیٹھے پھر سوتے سوتے

اور اسی طرح جب ہم جوئے شیر لے آتے یعنی صبح ہو جاتی تو محسوس یوں ہوتا کہ ؎

صبحدم صحنِ گلستاں میں صبا کے جھونکے
آتشِ دردِ محبت کو ہوا دیتے ہیں

شہرِ جاناں کی سمت روانہ ہوئے اور دور سے بستی کے نشانات نظر آنے لگے تو یہ شعر زباں پر تھا کہ ؎

بُوئے زلفِ مشکبار آنے لگی
دیکھ نیّرؔ شہرِ جاناں آگیا

اور پھر جب ناکامِ آرزو واپس لوٹے تو زبان یوں نوحہ سرا تھی کہ ؎

میں ان حسین نظاروں کے پاس آ نہ سکا
خزاں نصیب بہاروں کے پاس آ نہ سکا

اور بالآخر وہ وقت آگیا کہ ؎

بہارِ صبح نے گل کو رُلا کے چھوڑ دیا
شرابِ ناب کو شبنم بنا کے چھوڑ دیا

اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ ؎

شبِ فراق کی اک یادگار بھی تو نہیں
اب اک ستارۂ شب زندہ دار بھی تو نہیں

اور آخر میں دل کی دنیا کیا اجڑی کہ سب کچھ اُجڑ گیا ؎

كان لم يكن بين الحجون الى الصفا
انيس ولم يسمر بمكة سامر

اس کے بعد اس حکایتِ درد کو اب یہیں ختم کرتا ہوں ؎

ومن بعد هذا ما يدق بيانه
وما كتمه احظى لديه واجمل

"شہرِ غزل" کی تمام غزلیں اسی داستانِ الم اور افسانۂ غمِ ناکامیٔ جاوید سے بھری ہوئی ہیں ۔

(۱۱)

زندگی اب جن دو حادثوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ان میں ایک رفیقۂ حیات کی موت کا سانحہ تھا اور دوسرا قیامِ پاکستان کے وقت مظلوم انسانوں کے کشت و خون کا نظارہ۔

رفیقۂ حیات کی موت زندگی میں میرے لئے بڑا خانہ برانداز دل و دماغ حادثہ تھا۔ رفاقت اور وہ بھی غربت اور تنگ دستی کے زمانے کی رفاقت ایک ایسی یاد ہے جو ہمیشہ ساتھ رہی۔ "یادِ رفتگان" کے زیرِ عنوان "ایک یاد" میں اسی روح فرسا حادثہ کی جانب اشارہ ہے۔

بعد میں اس زخم کے اندمال کی متعدد تدبیریں کی گئیں اور اس کے لئے ایک بار بھوپال کا سفر کیا تو دوسری مرتبہ جالندھر کا۔

جالندھر کے گلی کوچوں سے جو وابستگی قائم ہو گئی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد دوبارہ جب ایک مجلسی تقریب کے سلسلے میں جالندھر روانہ ہُوا تو یہ شعر زبان پر تھا ؎

جہاں کبھی مرا عہدِ شباب مچلا تھا
نگاہ میں وہ در و بام لے کے آیا ہوں

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد ہندوستان اور بالخصوص مشرقی پنجاب میں کشت و خون کے سلسلے میں مسلمانوں کے لٹے پٹے اور تباہ حال قافلے جب لاہور میں مستی دروازہ کے باہر گھر کے سامنے سے گزرتے تھے اور اس پر لیڈروں کی بے اعتنائی کا تصور آنکھوں کے سامنے آتا تو جگر فرطِ غم سے پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک شعر اس طرح ہو گیا کہ ؎

نہ رہنما ہے، نہ منزل، نہ راہ لے نہ بتر
یہ لوگ چل دیئے کس سمت کارواں بن کر

اور پھر جب دل فرطِ غم سے زیادہ بھر آیا تو شدّتِ الم اس طرح شعر کی صورت میں ڈھل گئی ؎

گلرنگ ہے دامانِ شفق گریۂ خوں سے
یہ صبحِ وطن شامِ غریباں تو نہیں ہے

(۱۲)

"شعر و حکمت" کی تقریباً تمام تر نظمیں اور غزلیں ۱۹۲۵ء کے بعد کی ہیں اور ان کا تعلق بیشتر عروس البلاد لاہور کے گلی کوچوں سے ہے۔ غزلوں سے متعلق قبل ازیں اشارہ کر چکا ہوں اور بعض نظموں کا پس منظر بھی بیان ہو چکا ہے۔ اب اس سلسلے میں جو بعض ضروری گزارشات رہ گئی ہیں وہ ذیل میں عرض کرتا ہوں۔

"محرابِ حرم" کی نظمیں زیادہ تر مذہبی اور ملی جذباتِ عقیدت و ذوق سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ "ساقیٔ کوثر کے حضور میں" اور "داتا کے حضور میں" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ "پیامِ عید" "عیدِ بہار" اور "عیدِ اضحیٰ ریگ زارِ عرب میں" عید کی ہنگامی تقریبات پر لکھی گئیں جو مقامی اخبارات و مجلات میں شائع ہوئیں۔

"یادِ رفتگاں" کا تعلق زیادہ تر حضرت اخترؔ شیرانی اور مولانا ابوسعید بزمیؔ مرحوم کی یاد سے ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بزمیؔ مرحوم کا انتقال امریکہ میں ہوا تھا۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کا تابوت ہوائی جہاز کے ذریعہ پاکستان لایا گیا۔ بزمی کے تابوت کی خبر سنکر" نظم اسی المیہ کی یادگار ہے۔ "بزمی کی تربت دیکھ کر" میں ایک جگہ بھجنی کا لفظ آیا ہے۔ یہ اس واقعہ کی جانب اشارہ ہے کہ اگست ۱۹۴۷ء جب کہ لاہور میں کشت و خون کا بازار گرم تھا ان دنوں بزمیؔ مرحوم ایک شام کو ماڈل ٹاؤن کی ایک ٹرک پر ٹہل رہے تھے۔ کہ اتنے میں سامنے سے گورکھا نوجوان کا ایک ٹرک آ گیا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ آپ کو گولی کا نشانہ بنائیں۔ یکایک تفتیشِ احوال کے لئے ایک صاحب ٹرک سے اتر پڑے اور پوچھا کہ تمہارا نام؟ آپ نے فرمایا بزمیؔ جسے اس نے بھجنی سمجھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ او ہو یہ تو بھجنی ہے اور ٹرک پر سوار ہو کر چل دیئے۔

"ایک یاد" رفیقۂ حیات کی وفات پر لکھی گئی اور مولانا ظفر علی خاں پر جو نظم ہے وہ

مولانا کی وفات کے بعد ایک تعزیتی جلسے میں پڑھی گئی۔

"تیرِ نیمکش" کی نظمیں تقریباً تمامتر رومانی ہیں اور کم و بیش یہی وہ نظمیں ہیں جو شعر میں میرے کر بنیادی فکر و ذوق کی ترجمان ہیں "خطاب بہ ساقی" ایک مختصر ساقی نامہ ہے اور "افسانہ" زندگی کا مختصر افسانہ ہے جس کے ساتھ منصوری اور ہردوار کی "سرزمین لچھمن و رام" اور "شام اودھ" کی چند یادیں وابستہ ہیں۔

"صبحِ بنارس" میں بنارس کی ایک کہانی ہے "کیفِ انتظار" میں شادی سے قبل کے چند احساسات ہیں جو ایک خاص موقع پر جمع ہو گئے تھے اور دعوتِ شوق میں اس زندگی کے لئے "صلائے عام" ہے جس کا رنگین پیام اختر نے دنیا کو دیا تھا۔

"کاغان کے نظارے" اور "کاغان میں وادی سیف الملوک کی جھیل پر ایک یاد" چند حسین یادوں اور سوانح کی روداد ہے۔

عشقِ سلمیٰ کی راہ میں اختر کے لئے بہت سے دشوار گزار مرحلے اور پہاڑیاں حائل تھیں جن کا عبور کرنا بیحد مشکل تھا۔ ؎

کیف الوصول الی سعاد ودونہا
قلل الجبال و بینھن حیوف

اور آپ نے اختر کے کلام میں جگہ جگہ ایک وادی کا ذکر پڑھا ہوگا۔ گجرات جاتے ہوئے یہ وادی راستے میں پڑتی ہے۔ اختر کی وفات کے بعد جب ایک مرتبہ دوبارہ اس وادی سے گزرا تو ایک مکمل داستان آنکھوں کے سامنے آگئی۔ "دیارِ سلمیٰ" اس وادی کی منظوم کہانی ہے جو اسی وادی میں لکھی تھی۔

"بارِ دگر" اور "بیادیک جلوۂ فرنگ" ایک المیہ ہے جس کا تعلق سرزمین سندھ سے تھا اور "مری" کے عنوان سے جو نظم شامل ہے وہ مری کے ایک حسین سفر کی روداد ہے جو ۱۹۵۶ء میں حضرت احسان دانش کی معیت میں ہوا۔ اس نظم کا محرک درحقیقت ایک خطِ حسن تھا جو مری میں ایک جگہ ڈاک خانے کے قریب نظر آیا تھا۔

"اشارات" کے زیرِ عنوان جو نظمیں جمع ہیں سیاست دانوں کے اعمال و احوال کی ترجمان ہیں۔ جن کی نااہلیت اور باہمی کشمکش نے قیام پاکستان کے بعد ملک کے تمام تر نظم و نسق اور معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ "نغمۂ سروش" ایک یوم اقبال کے موقع پر لکھی گئی جب کہ سابق وزراء نے اس قومی تہوار کو اپنے لیے "کشودِ کار" کا ذریعہ بنانا چاہا۔ "نغمۂ بہار" ایک بڑے وزیر کے حسین رقص کی کہانی ہے۔ "شرحِ اشارات" میں چند اشارات کی وضاحت ہے جب کہ مغربی پاکستان اسمبلی کے ایک اجلاس کے دنوں میں عروس البلاد لاہور میں بڑوں کی کوٹھیوں میں دولت کی خرید و فروخت کے لیے حسن و مئے و نغمہ کی خریداری کا سلسلہ بھی جاری تھا کہ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

گذشتہ صفحات میں میں نے اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دل تمام عمر اربابِ مناصب و اقتدار کی صحبتوں سے گریزاں رہا۔ خیال تھا کہ قیام پاکستان کے بعد اس ملک کی عنانِ حکومت شاہوں کی جگہ فقیروں کے ہاتھوں میں آئے گی لیکن ملک کی بدقسمتی کہ تقسیم کے معاً بعد جو لوگ اس ملک کے وارث بنا دیئے گئے وہ بڑی حد تک ذہنی اور فکری اعتبار سے انگریز کے زمانے کے سیاست دانوں ہی کی یادگار تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنے قبیح اعمال و افعال کے لحاظ سے ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔

"ہائے کراچی" میں کراچی کی اس "شاہانہ محفل طرب و نشاط" کی حسین روداد بیان کی گئی ہے جو پاکستان کے کلکتہ (کراچی) کی بساط پر آراستہ ہوئی۔

"اشاریہ" اور "بہار استقلال" کا تعلق اسی دور کے یوم استقلال کی حسین تقریبات سے ہے۔ "عیدِ بہار" میں اس دور کے امراء کی عیدِ نشاط اور ان کے عہدِ بہار کی نسبت چند تلمیحات ہیں اور "حسین بی بی" میں اس دردناک ڈرامے کی جانب اشارہ ہے جو ایک موسم سرما کی رات کو گجرات کی زمین پر

آسمان کے مغموم ستاروں نے دیکھا۔

(۱۳)

حکایتِ لذیذ میں قیامِ پاکستان کے بعد کے چند سفروں کی حکایتیں ہیں۔ نظم "بتانِ ہند کے نام" میں وہ پیام ہے جو ۲۸ اپریل ۱۹۵۶ء کو جالندھر کے ایک مشاعرہ میں پیش کیا۔ اس کے بعد کی تمام نظمیں مشرقِ وسطیٰ اور دیارِ مغرب کے سفر سے متعلق ہیں

"پیامِ شاعرِ پاکستان" کے عنوان سے جو نظم شامل ہے وہ طہران کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی جو ۱۹ جولائی ۱۹۵۷ء کو آقائے مؤید ثابتی کی صدارت میں سفارت کبریٰ پاکستان کے چمن میں منعقد ہوا تھا۔

"بوعلی سینا کے حضور میں" وہ نظم ہے جو میں نے ۱۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو ہمدان میں بوعلی سینا کے مزار پر پڑھی اور بعد میں بطور یادگار وہاں آویزاں ہوئی۔ فارسی غزل "اگر آں ترکِ انگورہ بدست آرد دل و جاں را" بحرِ اسود کے کنارے "انقرہ" کے ایک حسن رہگزر کی نگہ لطف و کرم کا نتیجہ ہے۔ "جواب نامہ" ایک منظوم خط ہے۔ جسے میں نے اس سفر میں اپنے عزیز دوست حکیم سید احمد علی صاحب خسروی کو ان کے ایک منظوم مکتوب کے جواب میں لکھا تھا۔

"ذکرِ معروف" کے نام کی نظم بغداد میں ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر لکھی گئی۔ "آستانۂ حسین پر" نظم اس وقت لکھی گئی جب کہ بغداد سے حلّہ، بابل، کوفہ اور نجف اشرف ہوتا ہوا ۲۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو کربلائے معلیٰ میں درِ امام حسین علیہ السلام پر پہنچا۔

نجفِ اشرف کی زیارت کے بعد دوپہر کی بے پناہ تپتی ہوئی دھوپ میں جب صحرا سے گزر رہا تھا تو حسین علیہ السلام کے قافلے کا تصور اور اس قیامت کی دھوپ میں اس رہگزر کا نظارہ دل کو تڑپا رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ جی بھر کے خاک اڑائی جائے ؎

سر پہ ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

اور اس کے بعد حرمِ اقدس میں پہنچا تو دیکھا کہ چاروں طرف سے درود و سلام کی بارش ہو رہی تھی جو آتا اپنی اپنی بولی میں اپنی کہانیاں بیان کرتا اسی اثنا میں ایک نو وارد نے ایک عجیب غمناک لہجہ میں "یاحسین جئت بیابك الكريم" کہہ کر عربی زبان میں اپنی کہانی ایک نظم کی صورت میں شروع کردی اس کی صدائے دردناک سے دل بھر آیا اور اب ہم نے بھی اس سرکار میں وہ سب کچھ کہنا شروع کر دیا جس کی تمنا دل میں لے کر آئے تھے۔

"بتانِ لبنان" البرج (بیروت) کی ایک محفلِ نغمہ کی یادگار ہے۔ جہاں "بتانِ عربی گو" بساطِ خاک کو حیاتِ نو و عمرِ دراز طرب و نشاط بخش رہے تھے۔

"شامِ دمشق" دمشق کی ایک محفل میں پڑھی گئی جہاں چند پاکستانی احباب جمع تھے اور "نذرِ عقیدت" سرزمین قدس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے حضور میں پیش کی گئی۔

"نذر مارگریٹ کے حضور میں" ۲۰ راگست ۱۹۵۷ء کو "پاکستان ہاؤس لندن" کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ "ایک حادثہ" ایک حادثہ کی یادگار ہے جو پیرس کے حسین ترین بازار "شانزا لیزے" میں پیش آیا اور نظم "گوتہ بزرگ" شاعر المان گوئٹے کے وطن "فرینکفرٹ" میں لکھی گئی۔

نظم "وادیٔ نیل" اس وقت لکھی گئی جب کہ دیارِ مغرب کا یہ مسافر یونان و روم کے کھنڈروں کی سیر کر کے علی الصباح قاہرہ کی سرزمین پر اتر کر نیل کے کنارے کھڑا ہوا اور مدت کے بعد اس کے کانوں میں حجازی لہجے میں اللہ اکبر کی دلنواز صدا گونجی۔

ان کے علاوہ اس سفر کی یادگار اور بھی متعدد نظمیں ہیں جنہیں اگر حالات نے مساعدت کی تو اس سفرنامے میں جس کا تصور دیر سے ذہن میں ہے

شامل کیا جا سکے گا۔

(۱۴)

جہاں تک جنوں کی حکایات خونچکاں لکھنے کا تعلق ہے "شعر و حکمت" کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اس سے قبل لکھیں جن میں سے کئی کے اوراق پریشاں کا نشاں اب میرے پاس بھی نہیں "ترانۂ خلافت" اور "میکدہ" کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ایک مختصر کتاب "اختر و سلمیٰ" کے عنوان سے اختؔر کی حیاتِ معاشقہ پر لکھی تھی۔

شعر و شاعری کے بعد دوسری چیز جس کے ساتھ سب سے زیادہ وابستگی رہی تاریخِ طب کا موضوع ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب "طبّ العرب" کے نام سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب مشہور مستشرق پروفیسر براؤن کی تالیف "اریبین میڈیسن" کا اردو ترجمہ تھی جس کے ابتدائی ۱۶۱ صفحات انگریزی سے اردو ترجمہ کی صورت میں تھے اور باقی ۴۰۰ صفحات تشریحات و تنقیدات پر مشتمل تھے۔

۱۹۵۸ء میں مجھے ٹرکش ہسٹری آف میڈیسن کی ایسوسی ایشن کا رکن نامزد کیا گیا اور اس ضمن میں حال ہی میں میری ایک کتاب "ترکی نظام طب کی تاریخ" شائع ہوئی جو ترکوں کی قدیم تاریخی طبی خدمات پر تبصرہ کی صورت میں تھی۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور زبان میں اضافات کے پیش نظر ایک حد تک زبانوں کی تحصیل کا شوق بھی قائم رہا چنانچہ عربی فارسی اور انگریزی کے بعد ترکی زبان کا اور پھر فرانسیسی زبان کا شوق پیدا ہوا اور حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے ان کے امتحانات پاس کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔

(۱۵)

ماضی و حال کی داستان بیان ہو چکی اور اب چند باتیں اپنے تجربہ کی بنا پر اردو شعر و ادب کے مستقبل کے سلسلے میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔

قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اختر کی معیت میں اردو ادب اور شعر میں انگریزی ہندی اور ایرانی الفاظ و تخیلات و افکار کے امتزاج کے ساتھ ساتھ عربی تصورات و طرز محاکات کے اضافہ کی جدوجہد جاری کی تھی یہ بات آج سے بیس سال پہلے کی تھی۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آج جب کہ ذرائع سفر کی آسانیوں نے تمام دنیا کو سمیٹ کر ایک شہر بنا دیا ہے اور ملک میں مختلف زبانوں کے ادب۔ علوم اور السنہ کی تحصیل کا شوق عام ہو چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ پاکستان میں اردو کے دامن کو نہ صرف عربی بلکہ بلوچی، سرحدی سندھی، بنگالی اور پنجابی زبانوں کے حسین الفاظ و افکار سے مالا مال کیا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں فرانسیسی، جرمن اور اطالوی ادب کی مفید چیزوں کا بھی اضافہ کیا جائے۔

اپنے گذشتہ سفر کے دوران میں جب کہ میں ایران، مصر، عراق، لبنان اور شام کے گلی کوچوں میں پھرتا تھا۔ خاص طور سے اس چیز کی جستجو میں تھا کہ موجودہ دور نہضت علمیہ نے فارسی اور عربی ادب اور شعر پر کس قدر حیرت انگیز وسیع اور ہمہ گیر اثر ڈالا ہے۔ اور فارس و عرب کے عصر حاضر کے شاعروں اور ادیبوں نے عربی اور فارسی زبانوں کو بلند سے بلند تر اور دنیا کی عظیم ترین کار آمد زبانیں بنانے میں کس قدر اہم پارٹ ادا کیا ہے اور اس کام میں خصوصیت کے ساتھ عارف قزوینی، خلیل جبران، حافظ جمیل، احمد شوقی اور ان کے ساتھیوں کا حصہ کس قدر اہم ہے۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے اردو اور اس کے مستقبل کا یہ مسئلہ ایک علیحدہ کتاب کا محتاج ہے اور ظاہر ہے کہ "شعر و حکمت" کا یہ مقدمہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا میرا مقصد یہاں اس ضمن میں صرف اس قدر عرض کرنا تھا کہ اردو شعر کی منزلوں کی جستجو میں میں نے کن کن راہوں کو عبور کرنے کی کوشش کی اور اس وقت بظاہر کون کون سی راہیں ایسی نظر آ رہی ہیں جنہیں عبور کرنا ہوگا۔

اپنی عمر میں جب سے ہوش سنبھالا ان آنکھوں نے اس ملک میں جہاں بے شمار سیاسی انقلابات دیکھے وہاں اردو ادب میں بھی تقریباً ہر دس پندرہ سال کے بعد ایک

نئے انقلاب کا دور نظر آیا جو بلا شبہ ایک نئے عہد کا داعی اور نقیب تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب قیام پاکستان کے بعد جدید ایرانی اور عربی ادب کی طرح اردو زبان بھی ایک نئے اور اہم علمی دور میں داخل ہوگی اور یقیناً ماضی کے معمارانِ ادب کی خدمات اس کے لئے سنگِ میل ثابت ہوں گی۔

اس گزارش کے بعد اب اپنی اس داستان کو ختم کرتا ہوں جسے آپ بلا شبہ "شعر و حکمۃ" کی داستان سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو ایک حد تک ماضیٔ قریب کے دور کی شاعری کے افسانے سے بھی! اور اپنے جنون کی ان منظوم حکایاتِ خونچکاں کو جنہیں قیام لاہور کے بعد گزشتہ پینتیس سال سے غزلوں اور نظموں کی صورت میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا پیش کرتا ہوں۔ اس کے حسن و قبح کا فیصلہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا اب یہ زمانہ اور آنے والا دور کرے گا میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا کہہ دیا اور کہتا رہا تا آنکہ ایک کتاب بن گئی۔ ع

افسانہ‘ کہ گفت نظیری کتاب شد

نیر واسطی

۲۲ر جولائی ۱۹۵۹ء

محرابِ حرم

نسیمِ حجاز

جو بہارِ باغِ خلیلؑ تھی کبھی نور میں کبھی نار میں
وہی لالہ کار تھی ہر طرف کبھی دشت میں کبھی غار میں
نہ وہ بتکدوں میں سنی کبھی، نہ وہ مسجدوں سے اٹھی کبھی
وہ صدا کہ نالۂ درد تھی کسی دل جلے کی پکار میں
جسے شوق راہِ صفا نہیں اسے نفع سعیٔ صفا سے کیا
اُسے بہرِ طوفِ حرم سے کیا نہیں جو بلائشِ نگار میں
عجب انقلابِ زماں ہوا کہ نظامِ دہر بدل گیا
نہ وہ گریہ موسمِ ابر میں، نہ وہ خندہ شامِ بہار میں
جو مسیحیوں کو لبھا گئی جو کلیمیوں کو لٹا گئی
وہ عجب نسیمِ بہار تھی جو چلی عرب کے دیار میں

ساقیٔ کوثرؐ کے حضور میں

کر عطا اپنی نگاہوں کی شراب اے ساقی
کہ ترا ساقیٔ کوثر ہے خطاب اے ساقی

جام پر جام لُٹا تیرے خرابات کی خیر
بھیک دینا ہے فقیروں کو ثواب اے ساقی

زلفِ شبرنگ کی گلبار گھٹاؤں کے تلے
اپنی آنکھوں کا پلا بادۂ ناب اے ساقی

تیرے جلوے کو ترستے ہیں ترے بادہ پرست
تابکے اپنے غلاموں سے حجاب اے ساقی

نوعروسانِ بہاراں کو صبا نے چھیڑا
بن گئی باغ کی ہر شاخ رباب اے ساقی

پھر اک انگشت سے مہتاب کے ٹکڑے کر دے
پھر اٹھا زلف کا چہرے سے نقاب اے ساقی

تو اگر خاک کو چاہے تو بنا دے اکسیر

ہے ترے پاس وہ حکمت کی کتاب اے ساقی
صحفِ دینِ براہیمؑ ہیں رخشندہ نقوش
رخِ روشن ہے ترا اُن کا جواب اے ساقی
آکے اک اک نے سنایا ترا افسانۂ حسن
ختم یوں تجھ پہ ہوا عشق کا باب اے ساقی
قابَ قوسَینْ کا غل فرش سے تا عرش ہوا
جُھک گئی توسنِ گردوں کی رکاب اے ساقی
نونہالانِ گلستاں پہ نہ آئی تھی بہار
تُو نے بخشا گل و لالہ کو شباب اے ساقی
لوگ کرتے ہیں خُمِ بادۂ رنگیں خالی
میری مستی تری آنکھوں کی شراب اے ساقی

دلِ نازک پہ ہے طوفانِ حوادث کی نگاہ
موج کے ہاتھ میں ہے جامِ حباب اے ساقی
اب نہ وہ گل، نہ وہ گلشن، نہ وہ رقصِ لبِ جُو
ہر طرف خار ہیں اور دشت و سراب اے ساقی

شورِ ناقوس برہمن سے دبی بانگِ اذاں
بت خدائی کے لگے دیکھنے خواب اے ساقی

خس و خاشاک تو پہلے ہی سے تھے خوار و زبوں
آج پھولوں کی بھی مٹی ہے خراب اے ساقی

میری نیندوں پہ جو چھایا تھا بہاروں کی طرح
آج آنکھوں سے گریزاں ہے وہ خواب اے ساقی

تیری رحمت کے سمندر میں جو طوفاں لے آئے
لے کے آیا ہوں میں وہ چشمِ پُر آب اے ساقی

منتظر چشمِ جہاں ہے کہ پھر اٹھے شاید
طرفِ کعبہ سے رحمت کا سحاب اے ساقی

طلائی جلوہ گاہ

غارِ حرا کو دیکھکر

پھول کو سامانِ نکہت خارزاروں میں ملا
ابنِ آدم کو سکونِ قلب غاروں میں ملا
ابتداء میں آدمی کا تربیت خانہ بھی غار
آخری تہذیبِ انسانی کا کاشانہ بھی غار

○

اللہ اللہ جلوہ زارِ منظرِ غارِ حرا
عرش سے اونچا بلندی میں سرِ غارِ حرا
ضو فشاں ہے خاکِ بطحا پر ستارے کی طرح
جلوہ گر ہے رفعتوں میں ماہ پارے کی طرح
مسکراتا ہے بلندی پر گھٹاؤں کی طرح
جھومتا ہے سنبلستان کی ہواؤں کی طرح

اِس کے دامن میں رواں ہے بیخودی کی سلسبیل
جس طرح زمزم پسِ دیوارِ بنگاہِ خلیل

○

ذرّے ذرّے میں ہوا پیدا رشوقِ آرزو
چٹکیاں لینے لگا سینے میں شوقِ آرزو
حسن پنہاں سے گریزاں عشق پایا حسن کا
قلّۂ کہسار پر چمکا ستارا حسن کا
آگیا صحرا میں آخر رنگ و بو کا کارواں
جس طرح مہتاب سوئے جلوہ گاہِ کہکشاں
جگمگا اٹھی فضا جلووں سے کوہِ نور کی
غار سے پھیلی زمانے میں تجلّی طور کی

○

آہ یہ غارِ حرا، گہوارۂ عرشِ بریں
عَلّمَ الانساں کا مکتب، مہبطِ روح الامیں
یہ جبینِ مصطفےٰ کی سجدہ گاہِ اوّلیں
مصطفےٰ ماجاءِ اِلّا رحمۃ للعالمیں

یہ خمستاں جس کی مے سے مست بزمِ ہوش ہے
سربلندی میں فرازِ چرخ سے ہمدوش ہے
شمع سے اس کی جہانِ زندگی روشن ہوا
دامنِ کہسار رشکِ وادیٔ ایمن ہوا

○

اللہ اللہ، رونقِ ایوانِ شاہِ دو جہاں
ہیں نمایاں مثلِ انجم جس میں سجدوں کے نشاں
آنسوؤں کے لعل و گوہر کا خزینہ ہے جہاں
ذرہ ذرہ اک درخشاں آبگینہ ہے جہاں
حسن تاباں ہے جہاں، جلوے فروزاں ہیں جہاں
سنگریزوں میں مہ و خورشید خنداں ہیں جہاں
جس کا ہر گوشہ جہانِ قدس کا افسانہ ہے
بادۂ توحید کا یہ اوّلیں خمخانہ ہے
جس کا پرتو ہیں تارے جس کا آئینہ ہے ماہ
ہے یہ اُس مہرِ درخشاں کی طلائی جلوہ گاہ

غزل

تری جالیوں سے پرے کبھی جو نگاہِ شوق نکل گئی
تری جلوہ گاہ جمال میں ترے آستاں پہ مچل گئی

یونہی رات عمرِ عزیز کی ترے انتظار میں ڈھل گئی
مری شمعِ محفلِ آرزو کبھی بجھ گئی، کبھی جل گئی

ترے کوئے ناز سے شور اٹھا کہ اک اور غمزۂ دلربا
تری تیغ حسن جہانستاں جو گلوئے عشق پہ چل گئی

کششِ نظامِ دل و نظر تری چشم لطف و کرم سے ہے
جو تری نگاہ بدل گئی تو ہر اک نگاہ بدل گئی

لَمعَاتُ حُسنِکَ اَشرَقَت جَذَبَاتُ عِشقِکَ اَحرَقَت
مری خاکِ وادیٔ طورِ دل تری برقِ جلوہ سے جل گئی

کوئی نذر کام نہ آسکی، تری بارگاہِ قبول میں
مگر اک فغانِ دلِ حزیں جو غزل کے روپ میں ڈھل گئی

مدینہ منورہ ——— ۱۷ جون ۱۹۶۰ء

سلام

تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
مرے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں

عطا ہوئیں جو عجم کے حسیں مناظر کو
وہ دلکشی، وہ ادائیں سلام کہتی ہیں

وہ عہدِ گل، وہ لبِ جو، وہ بزمِ سرو سمن
وہ قمریوں کی صدائیں سلام کہتی ہیں

زبانِ لالہ و گل ہے جو نغمہ سنجِ درود
تو بلبلوں کی نوائیں سلام کہتی ہیں

تمہاری یاد میں برسیں جو بن کے ابرِ بہار
وہ آنسوؤں کی گھٹائیں سلام کہتی ہیں

درِ قبول پہ جو بار یاب ہو نہ سکیں
وہ غم نصیب دعائیں سلام کہتی ہیں

تمہارے ہجر میں اٹھیں جو خانقاہوں سے
وہ اہلِ دل کی صدائیں سلام کہتی ہیں

تمہارے نام کی عزت پہ ہو گئیں جو نثار
وہ غازیوں کی وفائیں سلام کہتی ہیں

مرے وطن سے جو آئی ہیں لے کے بوئے وفا
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں سلام کہتی ہیں

مدینہ طیبہ ۱۸ جون ۱۹۶۰ء

پیامِ عید

گُل و گلشن پہ ہے رحمت کی گھٹا آج کے دن
اپنے مستوں سے بہت خوش ہے خدا آج کے دِن
بادۂ عیش سے بہکی ہے ہوا آج کے دن
نکہتِ شعر سے مہکی ہے فضا آج کے دِن
چار سو موجِ غنا، بادِ وزاں، حسن جواں
اپنی تقدیر پہ نازاں ہے دعا آج کے دن

لے کے آیا مہ و انجم کو فلک بہرِ نثار
جگمگایا ہے شبستانِ حرا آج کے دِن
اَللّٰھُمَّ لَکَ لَبَّیْکَ کی آوازوں سے
جھوم اٹھے دشت و جبل ارض و سما آج کے دن
جنّتِ گوش ہے اب تک جبلِ رحمت سے
خطبۂ صاحبِ لولاکَ لَمَا آج کے دن
وادیٔ ابن براہیمؑ سے آتی ہے صدا
عید ہے شوقِ شہادت کا صلا آج کے دن

عیدِ بہار

رنگ و نکہت سے ہے معمور فضا آج کے دن
گھر کے آئی ہے مسرّت کی گھٹا آج کے دن

وادیٔ نیل پہ چھایا ہے بہاروں کا سماں
گرم ہے مصر میں بازارِ وفا آج کے دن

خونِ مظلوم سے رنگیں تھی سمیرا کی زمیں
غیرتِ لالہ ہے ترکوں کی قبا آج کے دن

چمن آرا تھی حسینؓ ابنِ علیؓ کی تکبیر
رنگ لائی ہے زمینِ شہدا آج کے دن

چاند نے جُھک کے کیا گنبدِ خضرا کو سلام
مسکرائی ہے مدینے کی فضا آج کے دن

عنبر افشاں ہوئی اجمیر کے میخانے میں
خواجۂ چشت کے گیسو کی ہوا آج کے دن

ابنِ قاسمؓ کے گُلِ عارضِ رنگیں کی بہار
وادیٔ سندھ پہ ہے جلوہ نما آج کے دن

خطۂ جنّتِ کشمیر کے زندانوں میں
نغمہ پیرا ہے عنادل کی صدا آج کے دن

جنّتِ گوش ہے دہلی کے صنم خانوں میں
چار سُو زمزمۂ حمد و ثنا آج کے دن

خاکِ خیبر سے چٹاگانگ کے ایوانوں تک
شور ہے صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ آج کے دن

شعر کی خلوتِ مسرور کے خمخانے میں
مست ہے، نیّرِ آشفتہ نوا آج کے دن

عیدِ اضحیٰ

ریگ زارِ عرب میں

عید لائی عربستاں میں بہاروں کا سماں
جنّتِ قدس کے سرمست نظاروں کا سماں
بیتِ معمور ہے ہر ذرۂ صحرائے حجاز
بادۂ شوق سے لبریز ہے مینائے حجاز
رات کو ریت پہ سرسبز کھجوروں کا سماں
جیسے کمخواب میں لپٹی ہوئی حوروں کا سماں
یوں رواں دشت میں اونٹوں کی قطاروں کا ہجوم
جیسے دریا میں جہازوں کی قطاروں کا ہجوم
شب کو صحراؤں میں جگنو کے شراروں کا ہجوم
جیسے سیاروں کے آوارہ نظاروں کا ہجوم
چرخ پر جلوہ نما یوں مہِ تاباں کی پری
جیسے بلّور کی مینا مئے سیمیں سے بھری

گیت ٹیلوں پہ جوانانِ وطن گاتے ہیں
خرمئی زلفوں کو صحراؤں میں لہراتے ہیں

○

جھومتے حلقہ بگوشانِ حرم پھرتے ہیں،
چار سو خانہ بدوشانِ حرم پھرتے ہیں
مست جب جھوم کے تا بابِ سلام آتے ہیں
عرش سے عشق و محبّت کے پیام آتے ہیں
آئے میزاب پہ رندانِ حرم وقتِ طواف
لب پہ لبّیک ہے ہاتھوں میں ہے کعبے کا غلاف
چاہِ زمزم پہ وہ مستوں کی قطاروں کا ہجوم
جیسے میخانے پہ ہو بادہ گساروں کا ہجوم
دشت میں نہرِ زبیدہ کے نظاروں کا سماں
جیسے تسنیم کی شاداب بہاروں کا سماں
لاشریکَ لکَ لبیکَ کی ہر سو ہے صدا
یعنی منظور نہیں کوئی بجز ذاتِ خدا

○

جبلِ نور سے مستانہ ہوا آتی ہے
نشہ بر ساتی ہوئی بادِ صبا آتی ہے
شہرِ جاناں میں ترانوں کی نوا گونجتی ہے
طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا کی صدا گونجتی ہے

چار سُو بال فشاں وادیٔ سینا کی بہار
نور میں بھیگی ہوئی گنبدِ خضرا کی بہار

یُوں دمِ صبح مدینے میں اذاں ہوتی ہے
جیسے بچھڑے ہوئے عاشق کی فغاں ہوتی ہے

آہیں شعلوں کی طرح دل سے لپک اُٹھتی ہیں
جالیاں گنبدِ خضرا کی چمک اُٹھتی ہیں

جھومتی بدر کے میداں سے نسیم آتی ہے
باغِ فردوس کے پھولوں کی شمیم آتی ہے

خاکِ خیبر سے جو صحرا میں ہوا آتی ہے
اسد اللہ کے نعروں کی صدا آتی ہے

آج صحرائے منیٰ سے یہ ندا آتی ہے
جیتے ہیں وہ جنہیں مرنے کی ادا آتی ہے

نشاطِ خودی

دیکھ اَے چشمِ زمانہ مری تحقیر نہ کر
نقش ہیں میرے فسانے تری پیشانی پر
یادگارِ طربِ بزمِ ارسطو ہوں میں
شمع کی آنکھ کا ڈھلکا ہُوا آنسو ہوں میں
دفن ہیں مصر کی مٹّی میں خزانے میرے
یاد ہیں مشرق و مغرب کو فسانے میرے

مَئے اندوہ رُبا ہے مرے پیمانے میں
جو لُٹی تھی کبھی بغداد کے میخانے میں
میں زمانے کے مصائب کی دوا لایا ہوں
دل میں دردِ غمِ مخلوقِ خدا لایا ہوں
میری تدبیر سے صحت کے سمندر اُبلے
سینکڑوں ڈوبنے والوں کے سفینے اُچھلے

شیخؒ و شیرازیؒ و طبریؒ کی نشانی ہوں میں
عظمت و شوکتِ رفتہ کی کہانی ہوں میں
جُرعہ نوشِ قدحِ طوسیؒ و رازیؒ ہوں میں
مستِ خمخانۂ صہبائے حجازی ہوں میں

میرے سینے میں نہاں فلسفۂ سیناؔ ہے
میرا سینہ ہے کہ انوار کا گنجینہ ہے

یادِ رفتگاں

اختر

گھٹا کعبے سے اُٹھی اور برسی خاکِ ایراں پر
ہوئی رحمت کی بارش شعر و حکمت کے گلستاں پر
اسی گلشن میں حافظؒ نے سرودِ آتشیں چھیڑا
کنارِ آبِ رکنا بادسازِ دل نشیں چھیڑا
اسی محفل میں کھولے رازِ مستی آ کے جامیؒ نے
جہانِ شعر کو بخشا نظامِ نو نظامیؒ نے

جہانِ نو میں پھر اُردو غزل خوانوں کا دَور آیا
نئے رِند آئے اور رندوں کے پیمانوں کا دور آیا
اب اس محفل میں میرؔ و آتشؔ آتش بیاں آئے
جنابِ داغؔ آئے اور امیرِؔ نکتہ داں آئے
پھر آخر اِس چمن میں اخترِؔ رنگیں بیاں آیا
گلوں کا ہم نشیں آیا صبا کا رازداں آیا

وہ عذرا کے فسونِ ناز کی رنگیں ادا لایا
وہ بوئے زلفِ سلمیٰ کی بہارِ جانفزا لایا
عجب طرزِ نوائے کہنہ گدائے میکدہ آیا
زبانِ میر لایا اور بیانِ میرزا لایا
وہ بزمِ غالبِ رنگیں نوا کی یادگار آیا
وہ گلگشتِ چمن زارِ مصلےٰ کی بہار آیا

○

الٰہی! اُس کی تربت خلد زارِ نور ہو جائے
نسیمِ شہرِ خاموشاں شمیمِ حور ہو جائے
لحد کو اس کی یارب یاسمن زارِ جناں کر دے
اور اس کے نام کو نقشِ حیاتِ جاوداں کر دے

بیادِ اختر شیرانی

فضائے عشق کو ماتم گسار چھوڑ گیا
جہاں میں نقشِ وفا یادگار چھوڑ گیا

پیامِ دیدۂ افسانہ کار چھوڑ گیا
حکایتِ خمِ گیسوئے یار چھوڑ گیا

نظر میں اک خلشِ انتظار چھوڑ گیا
جگر میں اک تپشِ زرد کار چھوڑ گیا

سنا کے راہِ محبت میں نغمہ ہائے جنوں
قبائے لالہ و گل تار تار چھوڑ گیا

افق کے پار گیا خندہ زن بہاروں پر
چمن کو غمزدہ و سوگوار چھوڑ گیا

بساطِ خاک کو دے کر بہارِ لالہ و گل
چمن کے سینے پہ زخمِ بہار چھوڑ گیا

شبِ بہار میں تاروں کی روشنی کیلئے
متاعِ گریۂ خوننابہ بار چھوڑ گیا

پٹک کے جام زمانے کی بے ثباتی پر
نشانِ ہستیٔ ناپائیدار چھوڑ گیا

شراب و شعر کی رنگیں فضا پہ لہرا کر
سرودِ خمکدۂ نوبہار چھوڑ گیا

قسمتِ بادہ

حضرت اختر شیرانی اور مولانا حسرت کی ابدی آرام گاہوں کے قریب شراب کی بھٹّی برآمد ہونے کی اطلاع پر ـــــــ

○

بادشاہئ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں
آدمی کیوں نہ گدائے درِ میخانہ بنے
حرم و دیر سے کچھ بھی نہ ملا سجدوں کو
کیوں نہ سر خاکِ رہِ منزلِ جانانہ بنے
آگ کی سیج پہ نیند آگئی پروانوں کو
شمع اب زینتِ کاشانہ بنے یا نہ بنے
موجِ مے، نغمۂ نَے، آبِ رواں، حسنِ جواں
اک حقیقت ہے کہ افسانہ در افسانہ بنے
قسمتِ بادہ، کہ اس خاک پہ رندانِ ازل
گھر جہاں جا کے بنائیں وہیں خمخانہ بنے

ـــــــــــــــ

ایک یاد

چمن زارِ جہاں میں ہے بہارِ جانفزا اب بھی
گلے ملتی ہے سرمستی میں پھولوں سے صبا اب بھی

ابھی تک رنگ بھرتی ہے شفق لالے کے دامن میں
ابھی تک حشر برپا ہے عنادِل کے نشیمن میں

ابھی تک برقِ آوارہ ہے رقصاں کوہساروں میں
ابھی تک بیخودی سی چھا رہی ہے لالہ زاروں میں

چمن میں ہے نوائے سوز و سازِ آبشار اب بھی
غریقِ نشّہ ہے دوشیزۂ ابرِ بہار اب بھی

گھٹا کعبے سے اب بھی جانبِ میخانہ آتی ہے
ابھی تک میکشوں کو لغزشِ مستانہ آتی ہے

بچھاتا ہے زمیں پر فرشِ شب کو ماہتاب اب بھی
چمن میں ہے بہارِ نغمۂ و شعر و شباب اب بھی

غرض گلشن میں ہے ہنگامۂ حسن و ضیا برپا
وہی پھولوں کی رعنائی، وہی ساغر، وہی مینا
مگر اس بزمِ مے میں جب نہیں وہ دلرُبا ساقی
تو یہ گلشن، یہ پیمانہ، یہ میخانہ ہے کیوں باقی

بزمی کے تابوت کی خبر سُن کر

خبر آئی ہے کہ وہ ماہِ رواں آتا ہے
مہِ تاباں طرفِ کاہکشاں آتا ہے

جس کے انوارِ تبسم سے فضا تھی معمور
آج پہلو میں لیے سوزِ نہاں آتا ہے

جس کا مشتاق تھا مدت سے کنارِ راوی
سات دریاؤں سے وہ حسنِ رواں آتا ہے

محفلِ انجم و مہتاب کو برہم کردو
کہ وہ خورشیدِ جبیں نور فشاں آتا ہے

جب گیا تھا تو تمنائیں تھیں اُس کے ہمراہ
ساتھ اب قافلۂ آہ و فغاں آتا ہے

یادِ لاہور نے شاید اسے بیچین کیا
اپنے وعدے سے بھی پہلے جو یہاں آتا ہے

بزمیؔ مرحوم کی تربت دیکھ کر

جو غار بن چکی تھی

آہ، اے خاکِ بزمیؔ مرحوم
تیرے تابوت کو ہزار سلام

کہہ رہا ہے زبانِ حال سے جو
شکوۂ جورِ گردشِ ایّام

تو ہے عنوان اس کہانی کا
جس کی تفصیل ہے الم انجام

اب نہیں تیرے در پہ میرؔ و زبیرؔ
اِک شجر ہے جو کر رہا ہے سلام

رونے والوں کی فکر کیا تجھ کو
تجھ پہ گریاں ہے چرخِ نیلی فام

مٹ چلا تیرا نقشِ قبر تو کیا
صفحۂ دہر پر ہے تیرا نام

پھول تربت پہ گر نہیں ہیں تو کیا
ہے ہر اک ذرّہ یاسمیں اندام

بن گئی غار تیری قبر تو کیا
اس میں پنہاں ہے نورِ ماہِ تمام

جھک گئی فرطِ خاکساری سے
اُف! اتری قبر کا بلند مقام

○

کاش تیرا جسد وہیں رہتا
ہیں جہاں اہلِ فن بلند مقام

کاش اُس وقت قتل ہو جاتا　　جب کہ "بھجنی" رکھا گیا ترا نام
جو بدلتے ہیں رخ زمانے کا　　ہیں یہاں وقفِ گردشِ ایّام

○

تجھ کو پردیسیوں نے پہنچایا　　تیرے لاہور میں بصد اکرام
آئے نیو یارک کے نمائندے　　تیری میّت پہ بہرِ عرضِ سلام
لیکن اہلِ وطن نہ جان سکے　　اپنے عالی گُہر کا اوجِ مقام
آہ، اِن تنگ ظرف زندوں نے　　تجھ کو پھینکا سمجھ کے ٹوٹا جام
لیکن اے دوست! میرے پیارے دوست!
دِل میں نبّؔر کے تو رہے گا مدام

مولانا ظفر علی خاںؒ

لٹا جو گلشنِ دہلی کا کاروانِ بہار — تو شاخِ گل پہ عنادل کا آشیاں نہ رہا
بساط الٹ گئی جب محفلِ شبانہ کی — وہ کہکشاں، وہ ستارے، وہ آسماں نہ رہا
صبا کی چال میں مستانہ لغزشیں نہ رہیں — گلوں میں رنگِ بہارِ شرر فشاں نہ رہا
زبان گنگ ہوئی جرأتِ بیاں کے لئے — قلم میں شعلۂ شمشیرِ اصفہاں نہ رہا
صدائے طوق و سلاسل سے گونج اٹھے زنداں — نوائے لشکرِ احرار کا نشاں نہ رہا
قبائے صوفی و ملا غریقِ بادہ ہوئی — جلالِ منبر و محراب کا سماں نہ رہا
خدا فروش فقیہوں کی بک گئی دستار — دلوں سے ربطِ ہم آہنگیٔ زباں نہ رہا
جھکا لیا اسے انگریز کی سیاست نے — سرِ اکابرِ دیں زینتِ سناں نہ رہا

خزاں کے ہاتھ میں تھا نظمِ گلستانِ وطن
زمیں کے حال پہ گریاں تھا آسمانِ وطن

○

اٹھا چناب کی وادی سے ابرِ مہار — زمینِ وادیٔ گنگ و جمن نکھار آیا

مثالِ گریۂ ابرِ بہار اشک فشاں | بسانِ خندۂ شمشیرِ آبدار آیا
اٹھا قدم تو گل و لالہ نے قدم چومے | ہر ایک سرو لئے رایتِ بہار آیا
پھر آئی حافظ و رومی کی انجمن میں بہار | شرابِ حافظ و رومی کا بادہ خوار آیا
ہر ایک گام پہ اقبال ہمرکاب ہوا | جہانِ حالی و شبلی کی یادگار آیا
ابوالکلام و محمد علی کی محفل میں | زمینِ ملکِ صحافت کا تاجدار آیا
ہوئی زمیں پہ درود و سلام کی بارش | وہ مدح خوانِ رسولِ فلک وقار آیا
زباں پہ اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ | لیئے بتوں میں وہ توحید کی پکار آیا
ہر اک محاذ پہ زنجیر و دار سے کھیلا | لیئے جلو میں وہ زنجیر و طوق و دار آیا
تمام عمر وہ برق و شرار سے کھیلا | قلم میں برق، زباں پر لیئے شرار آیا
فضائے سرو و سمن میں بہار سے کھیلا | لیئے لبوں پہ وہ صد نغمۂ ہزار آیا

ظفر علی ظفرِ دین و ملّتِ اسلام
رہے گا دہر میں زندہ ظفر علی کا نام

تیرِ نیمکش

خطاب بہ ساقی

چشمِ مَیگوں ہے تری بادہ چکاں اَے ساقی!
تیرے ساغر سے ہے سرشار جہاں اے ساقی!

تو نے پھر ابلقِ ایّام کا رُخ پھیر دیا
تھی ترے ہاتھ میں قسمت کی عناں اے ساقی!

تو نے صحرا میں پھر اک آبلہ پا بھیج دیا
خشک تھی دیر سے کانٹوں کی زباں اَے ساقی!

مِٹ گئے اور سب آثارِ جم و کَے، لیکن
تیرا خمخانہ ہے آباد یہاں اَے ساقی!

مجھ کو اُس شاعرِ رومان سے ہے نسبتِ خاص
تھا جو سرحلقۂ رندانِ جہاں اَے ساقی!

افسانہ

فسانۂ شبِ ہجر و وصالِ یار ہُوں میں
خزاں نصیب ہوں، پروردۂ بہار ہُوں میں

فغانِ یاس ہُوں ہیں، نالۂ ہزار ہُوں میں
چمن میں رہ کے بھی بیگانۂ بہار ہُوں میں

ہوائے صبحِ طرب جس کو لہلہا نہ سکی
چمن میں وہ گُلِ نورستۂ بہار ہوں میں

چمن میں آتشِ گل نے چمن کو پھونک دیا
چمن کے شعلہ عذاروں کا سوگوار ہوں میں

○

حریمِ دل میں نہ گو بجا کبھی ترانۂ شوق
سوادِ یاس میں اک ماتمِ بہار ہوں میں

کسی کا پرتوِ عارض ہے مجھ پہ جلوہ فگن
چمن پہ سایۂ رنگینیٔ بہار ہوں میں

شریکِ رنج ہوں سلمائے تیرہ اختر کا
دلِ شکستۂ عذرا کا غمگسار ہوں میں
بیادِ شامِ شبستانِ مہوشانِ اودھ
سحابِ گریہ سے اب تک ستارہ بار ہوں میں
مری جبیں پہ ہے گردِ زمینِ لچھمن رام
دیارِ عشق و محبت کا رہسپار ہوں میں
بفیضِ شاعرِ سلمائے رنگ و نکہت و نور
بہارِ شعر ہوں میں، شاعرِ بہار ہوں میں
طبیبِ عصر ہوں اور شاعرِ یگانۂ عصر
ہنر میں حضرتِ مومن کی یادگار ہوں میں

کیفِ اِنتظار

میرے سرودِ شعر کی دنیا کب آئے گی
اِس انجمن میں انجمن آرا کب آئے گی؛

انجم ہیں بیقرار کہ قدموں پہ ہوں نثار
وہ رشکِ حسنِ ماہ و ثریّا کب آئے گی؛

شرمندہ اُس سے رونقِ بازارِ مہر و ماہ
دل جس کا مشتری ہے وہ زہرہ کب آئے گی؛

سنبل کو پیچ و تاب ہے نرگس کو انتظار
وادی میں بوئے زلفِ سلیمیٰ کب آئے گی؛

اک بے نوا فقیر کی آغوشِ شوق میں
سلطانہ حسین و خود آرا کب آئے گی؛

مدّت ہوئی کہ خانۂ راہب ہے بے چراغ
وہ روشنیٔ دشتِ تمنّا کب آئے گی؛

میری شراب خسرو و غالب کی مے نہیں
ہشیار جس سے دِل ہو وہ صہبا کب آئے گی؛

دیکھا تھا بام پر اسے ہمجولیوں کے ساتھ
اب دیکھنا ہے یہ کہ وہ تنہا کب آئے گی؛

اِک نیم جاں طبیب ہے بیمارِ دردِ ہجر
بہرِ شفا وہ جانِ مداوا کب آئے گی؛

بیادِ یک جلوۂ فرنگ

ایک یاد

وہ بجلیاں سی دل پہ گرا کر چلی گئی
بدلی کی طرح روح پہ چھا کر چلی گئی

پہلے بہارِ عشق دکھا کر چلی گئی
پھر جامِ زہرِ عشق پلا کر چلی گئی

آئی سوادِ سند ھ سے اک رنگ و بو کی موج
جو سیلِ رنگ و بو میں بہا کر چلی گئی

وہ لالہ گوں لباس، وہ گردن چراغِ طور
سرِ آندھیوں میں شمع جلا کر چلی گئی

سرخی لبوں کی سرخیٔ افسانۂ حیات
سو حسرتوں کا خون بہا کر چلی گئی

وہ حلقہ ہائے گیسوئے زریں کا سر پہ تاج
سکۂ دلوں پہ جس کا بٹھا کر چلی گئی

سوزِ فراق سے درو دیوار جل اٹھے
دیوار و در کو آگ لگا کر چلی گئی

بیٹھی تو نظمِ گردشِ ایام رک گیا
اُٹھی تو ایک حشر اٹھا کر چلی گئی

اک عالمِ اصولِ کتاب و حدیث کو
وہ صومعہ کی راہ دکھا کر چلی گئی

رشکِ مسیح، روحِ کلیسا، خدائے حسن
تثلیث کی کتاب پڑھا کر چلی گئی

شاداب ہو گیا چمنستانِ کائنات
ایسی بہار آئی اور آ کر چلی گئی

ایک یاد

وادیٔ کاغان میں سیف الملوک کی جھیل پر

پھر وہی گل بدن و سبز قبا یاد آئی
پھر وہ فردوسِ نظر، حور لقا یاد آئی

پھر وہی ساقیۂ ہوش ربا یاد آئی
پھر وہ میخانے پہ رحمت کی گھٹا یاد آئی

عنبر افشاں ہے تصوّر میں پھر اک غالیہ مُو
پھر وہ لہراتی ہوئی زلفِ دوتا یاد آئی

نور و نکہت سے ہے معمور دیارِ کاغان
کہ مجھے کوچۂ جاناں کی فضا یاد آئی

دیر سے سازِ دل و تارِ رگِ جاں تھے خموش
زخمۂ عشق کو نغمے کی نوا یاد آئی

از افق تابہ افق نور کے پردے لہرائے
کس تکلف سے وہ تصویرِ حیا یاد آئی

کس پری وش کا گواوں نے سنایا مجھے گیت
کہ مجھے ایک پرستاں کی فضا یاد آئی

گلِ خودرو کی غم انگیز کہانی سن کر
غنچۂ دل کے چٹکنے کی صدا یاد آئی

تھی جبیں دیر سے محرومِ عبادت گہِ حسن
للہ الحمد کہ پھر یادِ خدا یاد آئی

کاغان کے نظارے

وادیٔ رنگ و بو کی بہاروں میں کھو گیا
کاغان کے حسین نظاروں میں کھو گیا

نسرین و نسترن کی قطاروں میں کھو گیا
اِن سے نکل گیا تو چناروں میں کھو گیا

لاہور سے چلا تھا لئے ہوش کی متاع
آکر یہاں جنوں کے دیاروں میں کھو گیا

اب ہر قدم ہے منزلِ سرمستی و نشاط
سرمستیوں کی راہگذاروں میں کھو گیا

ہر خار و گل کو چوم رہا ہوں بہار میں
پھولوں میں کھو گیا کبھی خاروں میں کھو گیا

دریا کے کیف بار ترانوں کے ساز پر
رقصِ چنار و سرو کے دھاروں میں کھو گیا

پھولوں کی مشعلوں نے لگا دی چمن میں آگ
پھولوں کی مشعلوں کے شراروں میں کھو گیا

سرو و سمن کی وادیٔ طاقت شکار میں
مخمور ہرنیوں کے طراروں میں کھو گیا

مَیں شہرِ رنگ و نکہتِ سیف الملوک میں
پریوں کے مست مست اشاروں میں کھو گیا

مری

ماآل کے طُور پہ طوفانِ بہاراں دیکھا
نشّۂ و کیف میں ہر ذرّہ کو رقصاں دیکھا
خاک پر چاند کے ٹکڑوں کی قطاریں دیکھیں
مست و شاداب نظاروں کی بہاریں دیکھیں
شب کو بازار کے پُر نُور کنارے دیکھے
چار سو بہتے ہوئے حُسن کے دھارے دیکھے
خطۂ حُسن میں مہتاب کی وادی دیکھی
اپنی راتوں کے حسیں خواب کی وادی دیکھی
دامنِ کوہ پہ لہرائی تھی ساون کی گھٹا
نشّے کی طرح امنڈ آئی تھی ساون کی گھٹا
دُھند میں حُسن کی تصویر کا منظر دیکھا
ابر میں برق کی زنجیر کا منظر دیکھا

چاند کا گھر کے بادل سے نکلنا دیکھا
جُل پری کا لبِ جُو جُل سے نکلنا دیکھا
عشق پر حسن کی بیدادگری کو دیکھا
غمزۂ حسنِ خداداد مری کو دیکھا
شرحِ افسانۂ دل، ذکرِ حسینانِ مری
سرخیٔ قصّۂ غم، زہرہ جبینانِ مری
فلکِ حسن کے آوارہ ستارے دیکھے
عالمِ قدس کے سرمست نظارے دیکھے
زلفِ شبگوں کے تلے حُسن کی مُورت دیکھی
کفر کے سایہ میں قرآں کی سورت دیکھی
فطرتِ حسن کی آئینہ گری کو دیکھا
ساقِ بلقیس جمالانِ مری کو دیکھا
حسن کی شانِ دل آویز کے ساماں دیکھے
عشق کی بندگی و عجز کے عنواں دیکھے
حُسنِ شاداب کے پُرکیف نظارے دیکھے
راہ میں مست نگاہوں کے اشارے دیکھے

جلوۂ حسنِ درخشاں کو پریدہ دیکھا
مریمِ توبہ کے دامن کو دریدہ دیکھا
شیخ کے جُبّۂ زرتار کے ٹکڑے دیکھے
مفتیٔ شہر کی دستار کے ٹکڑے دیکھے
اِس طرح چہرۂ رنگیں پہ سرکتے تھے نقاب
جیسے بہتی ہو صراحی سے چھلک کر مئے ناب
ناز سے حسنِ خراماں کا نکلنا دیکھا
سرفروشانِ محبت کا مچلنا دیکھا
راہ میں حُسن سے عشّاق کی گھاتیں دیکھیں
چاند کے ساتھ ستاروں کی براتیں دیکھیں
مانگیں افشاں کی تجلی سے دمکتی دیکھیں
بجلیاں ساعدِ سیمیں کی چمکتی دیکھیں
بوئے پوشاک سے رستوں کا مہکنا دیکھا
ساریوں کا سرِ بازار لہکنا دیکھا
غازۂ حسن کے رنگین نظارے دیکھے
لبِ جاں بخش کی سرخی کے شرارے دیکھے

تھی کہیں سبز، کہیں زرد، کہیں لال پری
قاف کے حسن کی پریوں کا اکھاڑہ تھی مری
نغمۂ زہرہ سے معمور تھا ایوان مری
رقصِ تسنیم پہ رقصاں تھا کہستانِ مری
بال میں نجمہ و ناہید کا جلوہ دیکھا
رات کی گود میں خورشید کا جلوہ دیکھا
میکدے میں نظر آئے مئے رنگیں کے ایاغ!
جیسے مندر میں سرِ شام عقیدت کے چراغ!
عجب انداز سے کہسار پہ مے خوار چلے
جس طرف مست چلے ساتھ ہی کہسار چلے
رک گئے دیکھ کے چشمے لبِ عنابی کے
قافلے سرحدی و سندھی و پنجابی کے
یوں تو تاحدِ نظر حسنِ کہستاں دیکھا
ڈاک خانہ پہ خطِ حسن کو عریاں دیکھا
حلقۂ گیسوئے پرپیچ کی شانیں دیکھیں
تاج کے سایہ میں ابرو کی کمانیں دیکھیں

عشق کا راہِ عنایات کو تکنا دیکھا
حُسن کا وقتِ ملاقات جھجکنا دیکھا

خطۂ پاک میں آہوئے حرم کو دیکھا
کعبۃ اللہ کے دامن میں صنم کو دیکھا

صبحدم چادرِ شبنم میں گلستاں دیکھا
حسن کو ریشم و کمخواب میں عریاں دیکھا

دامنِ کوہ میں کلیوں کی جوانی دیکھی
حُسنِ سرمست کی شاداب نشانی دیکھی

چمنِ منتظرِ خلدِ بریں دیکھ لیا
ہم نے فردوس کو بالائے زمیں دیکھ لیا

دیارِ سلمیٰ

سلامٌ علےٰ نجدٍ و من حل بالنجد!

شہرِ گجرات سے گزرتے ہوئے

وہ نظر آتے ہیں آثارِ دیارِ سلمیٰ
جن کے پہلو میں مچلتی ہے بہارِ سلمیٰ

چشمِ اختر نے جلائے ہیں اشکوں کے چراغ
دیکھ کر خاک سرِ راہگزارِ سلمیٰ

اسی وادی میں اٹھا عارضِ فطرت سے نقاب
یہیں نازل ہوئیں آیاتِ بہارِ سلمیٰ

اُف! وہ اک رندِ خرابات کی مستیٔ سجود
آہ! یہ کعبۂ اُمیدِ دیارِ سلمیٰ

شاہد و شعر کی جنت سے غنیمت کا وطن
لہلہاتا ہے جہاں باغِ بہارِ سلمیٰ

اس کے ذرّوں پہ ہے خورشیدِ شرف جلوہ فگن
اس کے ٹیلوں پہ برستا ہے وقارِ سلمیٰ

شبِ مہتاب میں وہ صبح کے تارے کی طرح
اجڑا اجڑا نظر آتا ہے دیارِ سلمیٰ

اختر اک رات اسی وادیٔ سلمیٰ کی طرف
دل و جاں لے کے گیا بہرِ نثارِ سلمیٰ

شہرِ گجرات ہے اک میکدۂ نور و سرور
اللہ اللہ! اثرِ خاکِ جوارِ سلمیٰ

بارِ دگر

وادیٔ سندھ سے اک نور کا بادل اٹھا
حسن ہی حسن کا عالم نظر آیا ہے مجھے
پھر بلائیں مری لینے کو بلائیں آئیں
پھر کسی درد نے اٹھ اٹھ کے بٹھایا ہے مجھے
سایۂ زلف میں جامِ لبِ رنگیں کا سماں
بادہ نوشی کو گھٹاؤں نے بلایا ہے مجھے
میرے سجدوں کو نہ کعبے کی ہوا راس آئی
بتکدے میں دلِ ایماں زدہ لایا ہے مجھے
اک کماں دار نے پھر عشق کو للکار دیا
ایک صیاد نے قدموں پہ گرایا ہے مجھے
زندگی تلخیٔ ایام سے نالاں تھی مگر
اب یہ عالم ہے مزہ زیست کا آیا ہے مجھے

دعوتِ شوق

نہیں ہے دیر و حرم میں نشانِ مہر و وفا
اٹھو کہ کوئے سلمیٰ کو سجدہ گاہ کریں

بیادِ گیسوئے شبرنگ جام چھلکائیں
غمِ فراق کی راتوں کو رو سیاہ کریں

شراب و شعر نے بخشیں چمن کو رنگِ بہار
بہارِ عارضِ فطرت کو بے پناہ کریں

خدا کو لوگ غفور الرحیم کہتے ہیں
گناہ شوق کریں، شوق سے گناہ کریں

صبحِ بہار

صبحدم غنچے کھلے پھیلی سحر کی روشنی
باغ میں بادِ صبا رقصاں ہوئی مستانہ وار

آسماں پر اک سحابِ نور اُٹھا جھوم کر
بادۂ گلرنگِ شبنم سے ہُوا تر لالہ زار

پھول کا سینہ چمک اُٹھا شعاعِ مہر سے
اور اِس فانوس سے روشن ہوئی بزمِ بہار

ذرّہ ذرّہ میں ہُوا تاباں جمالِ دلفروز
بن گیا صحنِ چمن حُسنِ ازل کا جلوہ زار

صبحِ بنارس

رات تھی، دنیا اندھیری رات میں خاموش تھی
چادرِ ظلمت میں عصیاں کی طرح روپوش تھی
مست تھی، مدہوش تھی، سرشار تھی لیلائے حسن
بختِ عاشق کی طرح خوابیدہ تھی دنیائے حسن
آسماں پر ہر طرف پھیلا تا ہوا تاروں کا دام
دے رہا تھا خاک کو اک عالمِ نو کا پیام

○

یک بیک سنسار میں تبدیلیاں ہونے لگیں
رات کے تاروں کی پریاں چرخ پر سونے لگیں
پَو پھٹی، رقصاں ہوئے گلشن میں مرغانِ سحر
دھجیاں ہوکر لگا اڑنے گریبانِ سحر
آگئی دنیا میں اک تازہ بہارِ انقلاب
ہوگئی اب نوعروسِ حسنِ فطرت بے نقاب

ضو فگن چاروں طرف نورِ سحر ہونے لگا
عارضِ صبحِ بنارس جلوہ گر ہونے لگا
اُٹھ گئے بستر سے بھگت یادِ خدا کرنے لگے
برہمن جپنے لگے مالا دعا کرنے لگے

○

یاتری نکلے کہ گنگا جی چلیں اشنان کو
پُن سے دھوئیں پاپ کو راضی کریں بھگوان کو
مہر طلعت، مہ جبیں دینے لگے سورج کو جل
یعنی سونے پر لگے کرنے سہاگے کا عمل
ہو گئی صبحِ بنارس جلوہ گستر ہو گئی
کھِل گئی دل کی کلی دنیا منوّر ہو گئی

معرکۂ حُسن و عشق

محبّت کا اوّلین لمحہ

(صحرائے نجد میں خیمۂ لیلیٰ پر قیس کی تصویر دیکھ کر)

حُسنِ بے پروا ابھی محوِ خود آرائی نہ تھا
عشق اب تک واقفِ دستورِ رسوائی نہ تھا
بے خبر تھی دستِ نامحرم سے فطرت کی دلہن
تھا اچھوتا بادۂ رنگینِ گلہائے چمن
کاکلِ مشکیں کو پیچ و خم سے آگاہی نہ تھی
حسن کو غمزے سے دل کو غم سے آگاہی نہ تھی

ناگہاں پیدا ہُوا صحرا میں شورِ انقلاب
ہو گئی دنیائے آب و گِل سراپا اضطراب
شورشیں پیدا جہانِ آتش و گِل میں ہوئیں
آرزوئیں مضطرب کاشانۂ دِل میں ہوئیں
خارِ صحرا پاؤں کے تلوؤں کو کھجلانے لگے
گیسوئے مشکیں بڑے شانوں پہ بل کھانے لگے

قیس آوارہ ہُوا مجنوں ہُوا رسوا ہُوا
رات دن سودائیٔ زلف و رُخِ لیلیٰ ہُوا

تا بکے آخر اٹھاتا زحمتِ صبر و قرار
خیمۂ لیلےٰ پہ پہنچا بیخود و دیوانہ وار

یہ سماں لیلیٰ نے جب دیکھا تو ششدر رہ گئی
دردِ دل کی طرح اٹھی اور تڑپ کر رہ گئی

محوِ نظارہ ہوئے اب قیس اور لیلائے نجد
محشرِ ستانِ تمنا بن گیا صحرائے نجد

ہر دو جانب شوق کی آویزشیں ہونے لگیں
حسن و الفت میں بہم آمیزشیں ہونے لگیں

عشق کی شوریدہ سامانی نے لیں انگڑائیاں
چیخ اٹھی نوجوانی دیکھ کر لیلائیاں!

اِک نظر نے اس طرح دونوں کو مفتوں کر دیا
قیس کو لیلیٰ کیا، لیلیٰ کو مجنوں کر دیا

ہے یہ حسن و عشق کی دنیا میں وہ پہلی نظر
یاد رکھے گی عروسِ دہر جس کو عمر بھر!

پیامِ حیات

حُسنِ خُوں آشام

(عہدِ چنگیز کی ایک خنجر بکف حسینہ کی تصویر دیکھ کر)

صبح آئی، رات کے تاروں کی پریاں سو گئیں
کفر ٹوٹا، کفر کی تاریکیاں گم ہو گئیں
خوابِ نوشیں سے ہوا بیدار حسنِ صبح زا
دستِ گستاخِ صبا نے چھین لی شب کی ردا
صبحدم مہتاب کی تنویر دھیمی ہو گئی
آشکارا حسن کی شانِ کریمی ہو گئی

یک بیک چمکی جہاں میں تیغِ خوں آشامِ حُسن
قاتلِ رعنا نے دنیا کو دیا پیغامِ حُسن
چشم نرگس، زلف سنبل، سرو قد، غنچہ دہن
باغِ ہستی بن گیا گویا چمن اندر چمن
ہاتھ میں تلوار، چہرہ سرخ، پیشانی پہ بَل
نازِ محشر آفریں اندازِ گلبانگِ اجل

آ گئی جنبش میں ہر خشتِ خمستانِ حیات
بن گیا فردوسِ چشمِ شوق سامانِ حیات
خود بخود بجنے لگے تارِ ربابِ کائنات
ہو گیا حل عقدۂ بابِ کتابِ کائنات
لالۂ و گل خونِ انجم سے کھلے گلزار میں
تھی بہارِ باغِ ہستی حسن کے انوار میں
صبحدم روشن ہوا مہرِ منوّر کا چراغ
دھو دیئے خونِ سحر نے دامنِ گردوں کے داغ

کر گئیں زندہ جہاں کو حسن کی خونریزیاں
آ گئی تیغِ شعاعِ مہر سے پھولوں میں جاں

مغمومِ شباب

بیوہ کے آنسو

ہر سمت چھا رہی تھیں برسات کی گھٹائیں
سرمست تھیں ہوائیں، شاداب تھیں فضائیں
تھی ابر کی سیاہی چھائی ہوئی زمیں پر
گھونگھٹ پڑا ہوا تھا مہتاب کی جبیں پر
بادل مئے طرب کے ساغر لٹا رہے تھے
دنیائے رنگ و بو کو بیخود بنا رہے تھے
طائر جو چہچہوں میں مدہوش ہو رہے تھے
اپنے نشیمنوں میں خاموش سو رہے تھے

اک بدنصیب بیوہ اس رات اپنے گھر میں
ڈوبی ہوئی کھڑی تھی طوفانِ چشمِ تر میں
تاریک تھیں فضائیں، مغموم تھیں نگاہیں
عارض پہ گرم آنسو، ہونٹوں پہ سرد آہیں
رگ رگ میں نوجوانی انگڑائی لے رہی تھی
دل کو شکستِ دل کا پیغام دے رہی تھی

آنکھوں میں جلوہ گر تھی اک شانِ دلربائی
چہرے سے تھا نمایاں حالِ غمِ جدائی

دل کی ہر ایک دھڑکن کروٹ بدل رہی تھی
سینے میں یاس و غم کی گنگا اُبل رہی تھی

تنگ آ کے فرطِ غم سے بولی یہ نوجوانی
دنیا میں کوئی ہے جو میری سُنے کہانی

تھا رشکِ باغِ جنّت اِک روز میرا گھر بھی
اِک مہرِ حسن سے تھی تاباں مری سحر بھی

کھائی پچھاڑ میں نے شوہر کا ساتھ چھوٹا
میّت اٹھی تو مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹا

کس سے کہوں غمِ دل سویا ہے بھاگ میرا
ہے ہے، فلک کے ہاتھوں اجڑا سہاگ میرا

تصویرِ بیکسی ہے یا ہے مرا سراپا
افسوس یہ جوانی! افسوس یہ رنڈاپا!

حرمان و یاس و حسرت ہر سو ہے اور میں ہوں
اے بیوگی کے آنسو اب تو ہے اور میں ہوں

سحرِ موسیقی

ایک حسینۂ نازنین کی تصویر دیکھ کر جو شام کے وقت صحرا میں ایک چشمے کے قریب ساز بجا رہی تھی اور جنگل کے شیر اس کے ساز کی آواز پر اس کے قدموں میں پڑے لوٹ رہے تھے

سحر ہے اَے نازنیں! نغمۂ دلکش ترا

سَاز ہے دردآشنا　　سوز ہے صبر آزما

حُسن ترا دِل رُبا　　دِل ہے ترا بے وفا

سحر ہے اے نازنیں! نغمۂ دلکش ترا

○

طرزِ نوا ہے ترا، فتنۂ محشر طراز

اُف! یہ ترا سوز و ساز　　آہ! یہ تمکینِ ناز

یہ سخنِ دِل گداز　　یعنی حدیثِ نیاز

طرزِ نوا ہے ترا، فتنۂ محشر طراز

○

کیا ہی بہار نظر ہیں تری رعنائیاں

آہ! یہ زیبائیاں　　انجمن آرائیاں

زمزمہ پیرائیاں　　اور یہ لیلائیاں

کیا ہی بہارِ نظر ہیں تری رعنائیاں

○

اڑ گئے شیروں کے ہوش، سازِ نواریز سے
شعرِ دلآویز سے طرزِ بلاخیز سے
نغمۂ مے بیز سے شورِ شر انگیز سے
اڑ گئے شیروں کے ہوش، سازِ نواریز سے

○

جتنے ہیں شیر و پلنگ، مستِ بم و زیر ہیں
پیکرِ تصویر ہیں خستہ و دلگیر ہیں
بستۂ زنجیر ہیں کشتۂ شمشیر ہیں
جتنے ہیں شیر و پلنگ، مستِ بم و زیر ہیں

○

ساز کی آواز سے، بجنے لگے دل کے تار
رقص میں ہیں کوہسار وجد میں ہیں آبشار
شیر ہوئے بیقرار دل ہوئے بے اختیار
ساز کی آواز سے، بجنے لگے دل کے تار

اِشارات

پیغامِ سروش

افسردہ سی ہو گئی تھی محفل
پھر بزم کو ہوش آ رہا ہے

ہنگامۂ ہاؤ ہو ہے برپا
دیوانوں کو جوش آ رہا ہے

خُمخانے میں پھر ہے "اللہ اللہ"
پیغامِ سروش آ رہا ہے

پھر بامِ فلک پہ آج بادل
میخانہ بدوش آ رہا ہے

گُل پیرہنوں کے لعلِ لب پر
پھر اِذنِ "نبوش" آ رہا ہے

پھر پیرِ مغاں کی انجمن میں
ہر حلقہ بگوش آ رہا ہے

شکوہ ہے کہ لیکے نامِ اقبال
ہر قوم فروش آ رہا ہے

کانوں میں ہے، زلزلوں کی آہٹ
اک حشرِ خموش آ رہا ہے

نغمۂ بہار

(کراچی کے ایک حسین رقص کی رودادِ جمیل سن کر)

میکشو! مژدہ کہ پھر عہدِ بہاراں آیا
نغمہ و رقص و مئے ناب کا طوفاں آیا

جن سے راتوں کو برستی ہے مئے کیف و سرور
وہ فضائیں لئے پھر ابرِ خراماں آیا

رامش و رنگ کو بخشا گیا سامانِ فروغ
نور سے نغمہ بہم دست و گریباں آیا

رہنِ میخانہ ہوئی ریو و ریا کی دستار
مفتیٔ شہر سرِ میکدہ رقصاں آیا

مریمِ توبہ کو تھا ناز بہت عصمت پر
خیر مقدم کے لئے خود درِ عصیاں آیا

لالہ رُویانِ کلیسا ہوئے مجبورِ سجود
رقص میں جب سرِ آغاز تگرِ ایماں آیا

اب وہ دارا و سکندر کے بھلا دو قصّے
دَورِ جامِ جم و کیخسرو و خاقاں آیا

شرحِ اشارات

اے ربِّ ذوالجلال! یہ کیا دیکھتا ہوں مَیں؟
کعبے میں پھر بتوں کو خدا دیکھتا ہوں مَیں!

رخ پر سرورِ مے کی ضیا دیکھتا ہوں مَیں
یعنی جبیں پہ نورِ خدا دیکھتا ہوں مَیں

چہرے کی روشنی پہ سیہ گیسوؤں کی چھاؤں
گلزارِ میکدہ پہ گھٹا دیکھتا ہوں مَیں

روئے نگار و جامِ شراب و بہارِ عیش
ہر شے روا بنامِ خدا دیکھتا ہوں میں

○

خلوت نشینیاں تھیں حصارِ جمالِ دوست
اب عام بجز لطف و عطا دیکھتا ہوں مَیں

جو آستاں کہ قبلۂ حاجت رہا مدام
اُس آستاں کو قبلہ نما دیکھتا ہوں مَیں

جن انکھڑیوں کو مہر و وفا سے گریز تھا
اُن انکھڑیوں میں مہر و وفا دیکھتا ہوں مَیں
ہے آسمان خاک کے ذرّوں سے ہم کلام
"سلطاں بر آستانِ گدا" دیکھتا ہوں مَیں
لاہور کی زمین ہے فردوس اِن دنوں
حُوروں کو جس پہ جلوہ نما دیکھتا ہوں میں

○

ہر چیز داستان ہوئی جا رہی ہے آج
ہر آنکھ کو فسانہ سرا دیکھتا ہوں میں
بہکی ہوئی ہوا ہے تو مہکی ہوئی فضا
ہر سُو طلسمِ ہوش رُبا دیکھتا ہُوں مَیں
شاداب فیضِ حسنِ بہاراں ہے کائنات
جلووں میں محو ارض و سما دیکھتا ہوں میں
اُٹھتے ہوئے شباب کی انگڑائیاں نہ پوچھ
کون و مکاں میں حشر بپا دیکھتا ہوں میں،

ابریشمی لباس تنِ لالہ رنگ پر
فانوس زیرِ بندِ قبا دیکھتا ہوں میں

○

آنکھوں کے مست مست اشاروں کے ساتھ ساتھ
ہونٹوں پہ شعلہ ہائے نوا دیکھتا ہوں میں

نظریں جھکی ہوئی ہیں جو شرمِ وصال سے
بکھری جبیں پہ زُلفِ دوتا دیکھتا ہوں میں

آئیں پُجاریں صنمستانِ حُسن میں
ہاتھوں میں روشنیٔ حنا دیکھتا ہوں میں

ہر حور وش ہے راہزنِ ہوش و آگہی
ہر راہزن کو راہنما دیکھتا ہوں میں

بے نام تہمتوں کا سہارا لئے ہوئے
پیرِ حرم کی لغزشِ پا دیکھتا ہوں میں

ہائے کراچی

(غالب کی رُوح سے معذرت کے ساتھ)

تو نے لیا جو نام کراچی کا ہم نشیں!
"اِک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے"

وہ ذرّہ ہائے خاک پہ قوسِ قزح کا رنگ
ہر رہگذر پہ حُسنِ دِلآرا کہ ہائے ہائے

وہ سبزۂ حسیں پرِ طاؤس کی طرح
وہ اُس پہ ساریوں کا نظارا کہ ہائے ہائے

وہ سیلِ رنگ و نورِ کلفٹن کہ واہ واہ
وہ بحرِ رنگ و بو کا کنارا کہ ہائے ہائے

وہ جلوہ ہائے ناز، وہ پیغمبرانِ عیش'
رامش گرانِ انجمن آرا کہ ہائے ہائے

وہ آستانِ ناز پہ سجدوں کی آبرو
وہ کبر و نازِ حسنِ خودآرا کہ ہائے ہائے

ساغر میں ڈوبتی ہوئی وہ کشتیٔ حیات
بہتا ہوا وہ رقص کا دھارا کہ ہائے ہائے
چھنتی ہوئی وہ صبر کی طاقت کہ آہ آہ!
جاتا ہوا وہ ضبط کا یارا کہ ہائے ہائے
زلفوں کے پیچ و خم میں وہ الجھی ہوئی نگاہ
بالوں میں وہ گندھا ہوا تارا کہ ہائے ہائے
وہ جسمِ مرمریں پہ دوپٹے کی آب و تاب
وہ ساقِ صندلیں پہ غرارا کہ ہائے ہائے
وہ تاجرانِ نغمہ و شعر و مئے و شباب
وہ نقدِ جان و دل کا خسارا کہ ہائے ہائے
وہ تالیوں کی تال پہ سازوں کا زیر و بم
ڈھولک پہ ہرنیوں کا طرارا کہ ہائے ہائے
وہ جھانجنوں کے شور میں عرضِ نیازِ عشق
وہ التفاتِ حسنِ خود آرا کہ ہائے ہائے
شیریں لبوں پہ حافظِ شیراز کی غزل
اٹھتا وہ جامِ مے سے شرارا کہ ہائے ہائے

وہ بازوؤں کی قوس میں تغییرِ کائنات
وہ خاک پر فلک کا ستارا کہ ہائے ہائے

سانسوں کی مشکبار لطافت کہ واہ واہ
زلفوں کی بوئے عنبر سارا کہ ہائے ہائے

اظہارِ مدعا پہ وہ اک لغزشِ زباں
وہ چشمِ سرمگیں کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ شہدِ صافیٔ لبِ شیریں کہ واہ واہ
وہ جامِ تلخ و تند و گوارا کہ ہائے ہائے

پیرِ حرم کی لغزشِ مستانہ کے لئے
نازک کلائیوں کا سہارا کہ ہائے ہائے

اِشاریہ

سُنا ہے جشنِ استقلال ہے آج
ہوا محوِ ترنّم ہو رہی ہے

تعالیٰ اللہ زمیں بزمِ طرب کی
قدم بوسِ ثریا ہو رہی ہے

جوانی پا کے ذوقِ رامش و رنگ
متاعِ دین و دانش کھو رہی ہے

حسینوں کے لبِ رنگیں کی چھُوٹی
دلوں سے داغِ ایماں دھو رہی ہے

بفیضِ سرخیٔ لب ہائے لعلیں
عجب بزمِ چراغاں ہو رہی ہے

حنائی انگلیوں کا عکس لیکر
زمیں وادیٔ سینا ہو رہی ہے

کھنکتی چوڑیوں کے ساز کی لَے
شریکِ شکوۂ نَے ہو رہی ہے

کسی آغوش میں نجمہ ہے مدہوش
کسی پہلو میں زہرہ سو رہی ہے

نگاہیں اٹھ کے صہبا بن رہی ہیں
ادھوری شئے مکمل ہو رہی ہے

کسی نے صبر کے خرمن کو پھونکا
کوئی تخمِ محبت بو رہی ہے

نسیمہ نے اٹھائے مرمریں ہاتھ
ثریا رقص فرما ہو رہی ہے

فقیہہِ شہر کے ایماں کی غیرت
دوپٹوں کی ہوا میں سو رہی ہے

بہارِ استقلال

عجیب رنگ سے آئی بہارِ استقلال
کلی کلی ہے چمن کی پیامِ عیش کثیر
ہر ایک غنچہ پہ ہے میرِ کارواں کا لہُو
یہی ہے قائدِ ملت کے خواب کی تعبیر
بڑھے سوار، سواری چلی، علم لہرائے
نویدِ گوش ہے ہر سمت نعرۂ تکبیر
اسیر قید سے چھوٹے، فقیر سیر ہوئے
نئے گداؤں نے پائی بہائے تاج و سریر
سحر کے خُم میں ترانوں کے خون کی مئے ناب
فضا پہ تیر گیا کیفِ مستیٔ بم و زیر
لہک رہے ہیں فضاؤں میں ریشمی آنچل
دل و نظر ہیں غراروں کے پیچ و خم میں اسیر

طوافِ بادہ و مینا میں گیسوئے خمدار
لٹا رہے ہیں فضا میں شمیمِ مشک و عبیر
حنائی ہاتھ گلستاں میں جگمگائے ہوئے
ہجومِ گل میں چراغاں کی کھنچ گئی تصویر
حریمِ میکدہ میں گھنگھروؤں کی نذر ہوئی
کلاہ و جبہ و دستار کی متاعِ حقیر
حرم سراؤں میں گونجی صدائے چنگ و رباب
خرابِ خمکدۂ عیش ہیں وزیر و مشیر
مئے کہن بھی میسّر نگارِ نو بھی نصیب
ملی بفضلِ خدا صحبتِ صغیر و کبیر

عہدِ بہار

دامنِ نسرین و گل ہے تار تار اب کے برس
لے کے آیا ہے جنوں عہدِ بہار اب کے برس

وہ چراغاں لالہ و گل کے ستاروں سے ہوا
چرخ پر ہنستی ہے خاکِ لالہ زار اب کے برس

مہوشوں کے ساعدِ سیمیں کے گجروں کے لئے
لے کے آئی پھول پھر فصلِ بہار اب کے برس

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے وادی و کہسار پر
دودھ میں گویا نہائی ہے بہار اب کے برس

ساغر و مینا سے پھر چھلکیں فضا میں بجلیاں
باغ میں آیا ہے طوفانِ بہار اب کے برس

جن کی لے پر وجد میں آئے گی دیوارِ حرم
باغ میں گائیں گے وہ نغمے ہزار اب کے برس

حسین بی بی

اَے شمعِ حرم حسین بی بی! جا سوئے شہنشہِ مدینہ
سچّی ہے ترے نبیؐ کی ڈیوڑھی جھوٹا ہے عدالتوں کا زینہ
ہوتا ہے وہاں ہر اک سے انصاف رشوت کا وہاں نہیں قرینہ

○

کہنا کہ ترے حضور آئی! اک خستہ و عاجز و کمینہ
عفّت کی لٹی ہوئی کمائی عصمت کا گرا ہوا پسینہ
اک فصلِ سرشک و آہ کی رات اک موسمِ سرد کا مہینہ

○

آئی ہوں ترے حضور سرکارؐ اشکوں کا لئے ہوئے خزینہ
سورج سے تپش میں ہے، فزوں تر داغِ غمِ حسرتِ شبینہ
چھایا ہے ہر ایک سمت آقاؐ! دنیا پہ غبارِ بغض و کینہ

○

بازار میں لٹ گئے ہیں موتی — عفّت کے جواہرِ ثمینہ
چھینا گیا خاتمِ حیا سے — عورت کے شباب کا نگینہ
توڑا گیا تیشۂ جفا سے — ناموسِ وفا کا آبگینہ
لوٹا گیا دل کی سلطنت سے — تسکینِ حیات کا خزینہ
آلام سے داغ داغ ہے دل — داغوں سے ہوا دیوانہ سینہ

○

لائی تھی میں ساتھ ایک بچّی — اور تیری کتاب کا خزینہ
قرآں نے دیا مجھے دمِ صبح — پیغامِ وَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ
بچّی بھی ہوئی نثار تجھ پر — اے والیٔ مکّہ و مدینہ
برہم ہوا نظمِ بزمِ عالم
ساحل نے ڈبو دیا سفینہ!

حکایتِ لذیذ

بتانِ ہند کے نام

مئے وفا کا حسیں جام لے کے آیا ہوں
بتوں میں عشق کا پیغام لے کے آیا ہوں

دیارِ لچھمن و نانک کے کوزہ خانے میں
شرابِ حافظ و خیام لے کے آیا ہوں

جسے شفق کے حسیں آنچلوں نے دیکھا ہے
وہ جلوۂ سحر و شام لے کے آیا ہوں

وہ جس کو سن کے جگر پارہ پارہ ہوتا ہے
وہی حکایتِ بے نام لے کے آیا ہوں

جلا رہا ہوں اندھیرے میں آنسوؤں کے چراغ
عجب ستاروں بھری شام لے کے آیا ہوں

دیارِ عشق میں ہر گام پر کئے سجدے
نظر میں جلوۂ اصنام لے کے آیا ہوں

جہاں کبھی مرا عہدِ شباب مچلا تھا
نگاہ میں وہ در و بام لے کے آیا ہوں

بڑے مزے سے کٹی راہِ منزلِ غمِ عشق
کہ ہر قدم پہ ترا نام لے کے آیا ہوں

بہار آئی تو میں شہرِ لالہ و گُل میں
فروغِ بادۂ گلفام لے کے آیا ہوں

مری نوا سے نوائے سروش ہم آہنگ
غزل میں بادۂ الہام لے کے آیا ہوں

رخِ صبیحِ حسیناں سے روشنی لیکر
علاجِ تیرگیٔ شام لے کے آیا ہوں

نسیم گیسوئے گلشن میں شانہ کیا کرتی
میں خود بہار کا ہنگام لے کے آیا ہوں

مرے پیالے میں ہے شعر اور طرب کا سرور
عجب شراب، عجب جام لے کے آیا ہوں

جالندھر ۲۸ اپریل ۵۶ء

پیامِ شاعرِ پاکستان

بنامِ شعرائے ایران

بہرِ ایراں یک دلِ آتش بجاں آوردہ ام
تحفۂ از خاکِ پاکستانیاں آوردہ ام

شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود
از دیارِ خسروِ شیریں زباں آوردہ ام

نغمۂ رنگیں کہ اقبالش بپاکستاں نواخت
بہرِ نذرِ گلشنِ ایرانیاں آوردہ ام

شہرِ حافظ را کہ بر ہر ذرّہ اش از ما سلام
سجدہ ہائے آرزو ہائے جواں آوردہ ام

بوعلی سینا کہ نامش وردِ صبح و شامِ ماست
بہرِ خاکش اشکِ چشمِ خونفشاں آوردہ ام

طہران ۱۹ جولائی ۵۰ء

بحضرت شیخ الرئیس بوعلی سینا رح

حکیمِ شرق و طبیبِ فرید و شیخِ زماں
جلالِ عظمتِ آدم، جمالِ بزمِ جہاں

کمالِ علمِ تو پیرایۂ جہانِ جمال
جمالِ علمِ تو سرمایۂ جہانِ کمال

نظامِ حکمتِ قانونِ تو حیاتِ من ست
نجاتِ من ز شفاؤ شفا نجاتِ من ست

پیامِ دانشِ تو شانِ حجّتِ اسلام
بزیرِ سایۂ آوند عظمتِ اسلام

منم کہ نامِ تو وردِ کرم صبح و شامِ من ست
مئے مغانۂ فکرت شرابِ جامِ من ست

گذشت عمر در افسانۂ محبّتِ تو
خوشا نصیب کہ دیدم بہشتِ تربتِ تو

بشوقِ یک نگہت بیقرار آمدہ ام
کرم نما کہ غریب الدّیار آمدہ ام

ہمدان ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء

غزل

(بعد از معذرت از روحِ حافظؒ)

اگر آں تُرکِ انگورہ بدست آرد دل و جاں را
فروشم بہرِ چشمِ لطفِ اُو لاہور و ملتاں را

قتیلِ تیغِ ابرویم، شہیدِ تیرِ مژگانم
بمیدانِ وفا دیدم فنونِ حربِ ترکاں را

زہے رنگِ بہارِ اُو، خہے سرو و چنارِ اُو
خدا شاداب دارد گلشنِ ملکِ سلیماں را

○

منم آں بلبلِ رنگین نوائے باغِ پاکستاں
نوائے من بوجد آورد گلرویانِ ایراں را

بہ بیروت و عراق اکثر بیاد آوردہ ام نیرؔ
ہوائے گرمِ ملتاں را فضائے سرد کاغاں را

(استنبول ۲۸ جولائی ۱۹۵۷ء)

جوابِ نامہ

(بحضرتِ طبیبِ ہمدان احمد علی خسروی)

اے مقیمِ سرائے اہلِ کمال ... برادیم زہیں بہشتِ جمال
فخرِ ایران و نازشِ ہمداں ... تاجدارِ جہانِ فضل و کمال
وارثِ علمِ بوعلیؒ سینا ... مردِ والا گہر ستودہ خیال
بارک اللہ، عارفانہ کلام ... لوحش اللہ شاعرانہ کمال
لطفِ تو زیرِ سایۂ الوند ... بر منِ خستہ چوں نسیمِ شمال
بہرِ تسلیمِ دل ہمے داری ... خسروی شان و خسروی اقبال

دارم امید دیدِ روئے ترا
کاش بینم بہارِ کوئے ترا

(۱۵ر جولائی ۱۹۵۷ء)

ذکرِ معروفؒ

بہ بغداد یک مرد معروف بود
کہ از نامِ معروفؒ موصوف بود
بہ توحید و اخلاص آگاہ بود
ز رمزے کہ در قُل ھُوَ اللہ بود
شہِ بے کمر، خسروِ بے کلاہ
گدا و شہنشاہ و گیتی پناہ
رواں ذکرِ او از زمیں تا بہ چرخ
چہ خوش گفت سعدیؔ چو آمد بہ کرخ
نہ بینی کہ در کرخ تُربت بسے ست
بجز گورِ معروفؒ معروف نیست

بغداد ۲۱ جولائی ۱۹۵۷ء

آستانۂ حسینؑ پر

یا حُسینُ جئتُ ببابِکَ الکریم!

حسینؑ! تجھ کو مسافر نواز کہتے ہیں
ترے حرم کو حریمِ نیاز کہتے ہیں،
ترے حضور دلِ بے قرار لایا ہوں
سرشکِ دیدۂ خونابہ بار لایا ہوں
وہ دل کہ جذبۂ شوقِ جہاد جس میں ہے
بلاکشانِ مراکش کی یاد جس میں ہے

○

مدارِ عظمتِ کون و مکاں پہ آیا ہوں
درِ امامِ زمین و زماں پہ آیا ہوں
فغانِ وادیٔ کشمیر لے کے آیا ہوں
متاعِ دولتِ شبیرؓ لے کے آیا ہوں
بہارِ لالہ بھارِ زراں ہے الجزائر میں
کہ عام خونِ مسلماں ہے الجزائر میں
وہ خوں کہ جس سے صداقت کا نام روشن ہے
وہ خوں کہ جس سے بیاباں بھی آج گلشن ہے

○

دلِ حزیں ہے بہت مضطرب ملول مرا
سلام ہو مرے سلطانِ دیں قبول مرا
کہ تجھ کو سیدِ عالی مقام کہتے ہیں
تجھے حسینؑ علیہ السلام کہتے ہیں

کربلائے معلّیٰ ۲۲ جولائی ۱۹۵۷ء

بتانِ لبنان

نگہِ فقر میں سلطانِ جہاں کچھ بھی نہیں!
جو نہیں خاکِ درِ پیرِ مغاں کچھ بھی نہیں
کششِ عشق سے قائم ہے نظامِ ہستی
ورنہ بنیادِ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں
عارض و زلف سے ہے شام و سحر کی رونق
ورنہ یہ کارگہِ دورِ زماں کچھ بھی نہیں!
چمن آرا نہ ہو گر گلشنِ ہستی میں وہ گل
لالہ و یاسمن و بادِ وزاں کچھ بھی نہیں
رامش و رنگ کو دے وہ جو نہ سامانِ بہار
جلوۂ بزمِ گلستانِ جہاں کچھ بھی نہیں،
آئے گر ساقیٔ سرمست نہ پیمانہ بدست
فرشِ گل، موجِ صبا، سروِ رواں کچھ بھی نہیں
اک حقیقت ہے مئے لعلِ بتانِ بیروت
ورنہ بیتر یہ خراباتِ جہاں کچھ بھی نہیں

بیروت ۲۶ جولائی ۱۹۵۰ء

شامِ دمشق

(باز ہوائے چمنم آرزوست)

پھر کسی نے مری راتوں کو بنایا رنگیں — پھر کسی خوابِ محبت نے جگایا ہے مجھے
مے چکاں آنکھ پہ ہے چھاؤں گھنی زلفوں کی — ابرِ میخانہ نے میخوار بنایا ہے مجھے
ہمہ خوشبو، ہمہ نغمہ، ہمہ مستی، ہمہ رنگ — اک عجب پیکرِ رنگیں نے بھایا ہے مجھے

○

مطلعِ شام سے خورشید ہُوا نور فشاں — ہر طرف طور کا جلوہ نظر آیا ہے مجھے
مرکزِ قدس سے نازل ہوئیں آیاتِ جمال — بُت نے قرآن کا اعجاز دکھایا ہے مجھے

پھر حدیں مل گئیں کعبے سے صنم خانے کی
عشق آذر کدۂ حسن میں لایا ہے مجھے

دمشق ۲۴ جولائی ۱۹۵۷ء

نذرِ عقیدت

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے حضور میں)

کب راہِ محبت میں فنا تیرے لئے ہے — اے زندۂ جاوید بقا تیرے لئے ہے
انجامِ محبت کا مزہ تیرے لئے ہے — یعنی صلۂ روزِ جزا تیرے لئے ہے
اللہ و پیمبرؐ کی رضا دولتِ کونین — اللہ و پیمبرؐ کی رضا تیرے لئے ہے
تو دفن ہوا آکے رسولوں کی زمیں میں — آغوشِ رسل پیار سے وا تیرے لئے ہے
یہ چاندنی راتوں میں کھجوروں کی قطاریں — یہ مسجدِ اقصیٰ کی ہوا تیرے لئے ہے
لندن سے گیا پھر نہ غلاموں کے وطن میں — واللہ کہ وا بابِ دعا تیرے لئے ہے
تنہائیٔ زنداں میں وہ خلوت کی ملاقات — اس خلوتِ رنگیں کا مزا تیرے لئے ہے
وہ رات کی تنہائی میں سجدوں کی کرامات — وہ شب شبِ معراج نما تیرے لئے ہے
دنیا میں تو شاہوں نے تجھے قید میں رکھا — اب قربِ شہنشاہِ حرمؐ تیرے لئے ہے
بھولا نہیں بلبل کو ترا نالۂ دلدوز — فریاد سے معمور فضا تیرے لئے ہے
ہیں یاد چمن کو تری روتی ہوئی آنکھیں — تر گریۂ شبنم سے صبا تیرے لئے ہے

ہے تاروں بھری رات تری راہ میں بچھیں | رہوارِ فلک آبلہ پا تیرے لیے ہے
نسرین و صنوبر کے وطن میں ترا ماتم | سایہ کی سیہ رنگ قبا تیرے لیے ہے
تو ہند میں تھا تیغ حسینؓ ابنِ علیؓ کی | پیغامِ شہِ کرب و بلا تیرے لیے ہے
منقوش دلِ دہر پہ ہے تیرا فسانہ | اور سرخیٔ خونِ شہدا تیرے لیے ہے
پیتا رہا تو خونِ جگر قوم کے غم میں | جامِ مئے تسلیم و رضا تیرے لیے ہے
بیشک ترے مرنے پہ کھلے ہیں ترے جوہر | ہر سمت غم و آہ و بکا تیرے لیے ہے

اب کر کے تجھے یاد تڑپتے ہیں ترے دوست
ناقدریٔ عالم کا صلہ تیرے لئے ہے

(مزار مقدس پر پڑھی گئی ——————— ۲۷ جولائی ۱۹۵۷ء)

نذر

شہزادی مارگریٹ کے حضور میں

عشق کا کھیل ہوا تختِ شہِ لندن پر
سرِ ایڈورڈ جھکا پائے مسز سمپسن پر
جاگ اٹھی قسمت گلہائے شبستاں آخر
ملک کا تاج ہوا حسن پہ قرباں آخر

پھر ستاروں نے مہِ نور فشاں کو دیکھا
یوسفِ دل نے زلیخائے جواں کو دیکھا
عشق نے حسن پہ اقلیم کو قربان کیا
قصر کو تاج کو دیہیم کو قربان کیا

حسن کو خوابِ شہِ مصر کی تعبیر ملی
عشق کو سلطنتِ عشق سے جاگیر ملی
ہوش کی گود میں اک راہزنِ ہوش آئی
نئی دنیا کی دلہن اک نئی دنیا لائی

بربطِ دل سے محبت کی صدائیں اٹھیں
حسن کی شہر کولمبس سے گھٹائیں اٹھیں
بلبلوں نے چمنستاں میں نوائیں بدلیں
حوریانِ گل و لالہ نے قبائیں بدلیں

نشہ و کیف کا سامان چمن میں آیا
نکہت و رنگ کا طوفان چمن میں آیا
چارسو آتشِ گل آگ لگاتی آئی
باغ میں بادِ صبا دھوم مچاتی آئی

حسن نے عشق کو دیوانہ بنا کر چھوڑا
عشق کے راز کو افسانہ بنا کر چھوڑا

بن گیا قصرِ بکنگھم چمنِ شعر و شباب
سادہ پانی کا پیالہ بھی بنا جامِ شراب
عشق نے حسن کی سرکار سے پیمان کیا
تاج کی کہنہ روایات کو قربان کیا
لے لیا حسن نے آخر دلِ سلطاں سے خراج
جھک گیا حسن کے قدموں میں شہنشاہ کا تاج

دل ہُوا حُسن کی مورت پہ فدا دیں کی طرح
مۂ پرویں ہوئے قرباں گُل و نسریں کی طرح
پار لیمان نے گو چھین لیا تاج اُس کا
سارے عالم کے دلوں پہ ہے مگر راج اس کا

○

پھر اسی باغ میں اک اور گلِ تازہ کھِلا
جس سے مہکی چمنستانِ محبّت کی فضا
قصرِ ہیں ناز و تنعّم سے پلی مارگریٹ
بن گئی باغِ محبّت کی کلی مارگریٹ
جو محبّت کے لبِ شوق کا پیمانہ بنی
بادۂ کوثر و تسنیم کا میخانہ بنی
جس نے خوابوں کے جزیروں میں بسایا دل کو
دے کے دل ایک کو دنیا سے چھڑایا دل کو
تاجِ سلطاں پہ درخشاں ہوئی گوہر کی طرح
دِل پیٹر میں بسی بوئے گُلِ تر کی طرح
جُولیٹ بن کے رہِ عشق و وفا میں آئی
رُومیو کے لیے پیغام جنوں کا لائی
عشق انجام ہُوا حسن کے افسانے کا
شمع نے کام کیا بزم میں پروانے کا
لالہ و گل پہ جوانی کی ہوا لہرائی
کہ گُلِ گلشنِ لندن پہ صبا لہرائی
دل کو تڑپانے لگی لالہ و نسریں کی طرح
فصلِ گُل آ گئی دوشیزۂ رنگیں کی طرح

○

آہ لیکن چمنِ دل پہ خزاں آ کے رہی
عشقِ مسرور کے ہونٹوں پہ فغاں آ کے رہی
دمِ عیسیٰ نے رہِ عشق میں دم توڑ دیا
چارۂ دردِ غم و رنج و الم چھوڑ دیا
دیکھ لی عشق نے حسنِ رخِ برہم کی بہار
ایک ہی رات کی تھی خانۂ ولیم کی بہار
حُسن نے عشق کے پیمان سے منہ موڑ لیا
مذہبِ عشق کے عرفان سے منہ موڑ لیا

اُس کو معلوم نہ تھا سوزِ محبت کیا ہے
عشق کیا شے ہے، غمِ عشق میں لذت کیا ہے

اُس نے پہلے تو محبت کا چڑھایا ساغر
ابھی ہونٹوں سے لگا تھا کہ گرایا ساغر

تھی اگر تلخ مئے عشق، تو پینا ہی نہ تھا
دل کو نفرت تھی اگر غم سے تو جینا ہی نہ تھا

چور تھا دل میں اگر، دل کو چرانا ہی نہ تھا
روٹھنا تھا تو اسے اپنا بنانا ہی نہ تھا

تھی اگر خار، تو پھر کیوں گُلِ گلزار بنی؟
گردنِ عاشقِ ناشاد کا کیوں ہار بنی؟

چاند بن کر دلِ پیٹر میں سمائی کیوں تھی؟
ٹیمز پر عشق کے دریا میں نہائی کیوں تھی؟

بسترِ عشق پہ خوابوں کا سماں کیوں دیکھا
بربطِ عشق کو مجبورِ فغاں کیوں دیکھا؟

○

صنفِ نازک تھی اُسے پاس وفا کا نہ رہا
مرد پھر مرد تھا کردار میں مردانہ رہا

حسن پامال ہوا حور سے عورت ہو کر
رہ گیا بزمِ شبِ عیش کی جنت ہو کر

ہاں وہ عورت نہیں اس دَور کی شہزادی ہے
جس کا مقصودِ نظر عشق نہیں شادی ہے

ارضِ مغرب کی حکومت بھی سیاست بھی فریب
شاہزادی نے بتایا کہ محبت بھی فریب

شہرِ لندن میں عجب پیت کی ریتیں دیکھیں
نیائے کے کھیل میں انیائے کی جیتیں دیکھیں

دینِ مشرق ہے جدا مشربِ مغرب ہے جدا
اسکے اغراض وفا اس کے قوانین جفا

دخترِ شرق جب الفت میں زباں دیتی ہے
عشق کی راہ میں ہر گام پہ جاں دیتی ہے

○

وقفِ ذوقِ ہوس و آز ہے یورپ کا سماج
عشق و اخلاص میں حائل ہیں قوانینِ رواج

رگِ پیٹر میں شہنشاہ کا جب خون نہیں ۔۔۔ کورٹ کہتی ہے کہ تزویج کا قانون نہیں
نہ جچی تھی کبھی خلعت کی نگاہوں میں گلیم ۔۔۔ ہو گئی عشق میں بھی شاہ و گدا کی تقسیم
دے دی اک رسم نے آئینِ محبت کو شکست ۔۔۔ زر و گوہر سے ہوئی عشق کی دولت کو شکست
بندھ گئی زلف قوانین کی زنجیروں سے ۔۔۔ کٹ گیا حسن رِوایات کی شمشیروں سے
اُس کلیسا نے محبت کا گلا گھونٹ دیا ۔۔۔ جس نے عورت کی شرافت کا گلا گھونٹ دیا
ہو گئی ہار محبت کی تمناؤں کی ۔۔۔ بن گئی بات کلیساؤں کے پاپاؤں کی

○

حُسن آزارِ رہ و رسمِ وفا سے چھوٹا ۔۔۔ عشق لعنت گہِ دولت کی جفا سے چھوٹا
چشمِ گُل میں دلِ بلبل کی جو قیمت نہ رہی ۔۔۔ اس کے پیراہنِ رنگیں میں بھی نکہت نہ رہی
آنکھ میں مے گُل عارض پہ طراوت نہ رہی ۔۔۔ اب وہ شہدِ لبِ شیریں میں حلاوت نہ رہی
پہلے تھی روشنیٔ دیدۂ مریم کی طرح ۔۔۔ ہوئی اب عام ہر اک پھول پہ شبنم کی طرح
بلبلِ نغمہ سرا باغ سے صحرا کو چلی ۔۔۔ چھوڑ کر گلکدۂ عشق کلیسا کو چلی

بے وفا دل کو نہ اشکوں کی وفا راس آئی
حور کو نارِ جہنم کی ہوا راس آئی

○

(۲۰ اگست ۱۹۵۶ء کو پاکستان ہاؤس لندن کے مشاعرہ میں پڑھی گئی)

ایک حادثہ

(شانزا یلیزے کے بازار میں)

نہ رہا ضبطِ غمِ عشق کا یارا مجھ کو
اِک نگاہِ غلط انداز نے مارا مجھ کو

کام آیا مئے و مینا کا سہارا مجھ کو
اِک پری زاد نے شیشے میں اُتارا مجھ کو

مئے لعلِ لبِ رنگیں تری مستی کے نثار
کہ ہوئی "تلخیٔ ایام" گوارا مجھ کو

رات بھر ہیں مہ و خورشیدِ جہاں گردش میں
لے کے آیا مری قسمت کا ستارا مجھ کو

شام کو شانزا یلیزے کی بہارِ رنگیں
ہے مرے خواب کی جنت کا نظارا مجھ کو

پیرس ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء

بہ پیش گاہِ گوتہ بزرگ

شاعرے دانائے اسرارِ حیات
شعرِ او شیریں تر از قند و نبات
لفظِ اُو گلزارِ معنی را نسیم
از نوائے او دلِ ہستی دونیم
فاتحِ عالم بدونِ تیغ و تیر
در کمندِ فکرِ او انساں اسیر
در خیالِ او شنیدم بوئے اُو
دیدم آخر خاکِ راہِ کوئے اُو
یک صدائے دردناک آوردہ ام
تحفۂ از خاکِ پاک آوردہ ام

فرانکفرٹ۔ سی ایم اوت ۱۹۵۷ء

وادئ نیل

اِک فریب اور نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
مغربی رسم و روایات کے بازاروں میں

اب تمنّا تھی کہ جاکر وہ دکانیں دیکھوں
تھا جہاں معرکہ یوسفؑ کے خریداروں میں

بختِ بیدار بالآخر مجھے لے ہی آیا
وادئ نیل کے شاداب سمن زاروں میں

میری قسمت کا ستارہ مجھے آیا لیکر
جامعِ ازہرِ اسلام کے میناروں میں

دولتِ قلب و نظر روم نہ یونان میں ہے
ہے تو اسلام کے رنگیں چمنستان میں ہے

قاہرہ ۵ ستمبر ۱۹۵۷ء

شہرِ غزل

[illegible]

غزل

حیراں ہے آنکھ چشمِ عنایت کو کیا ہُوا
دنیا میں رسم و راہِ محبت کو کیا ہُوا

مانا کہ شہرِ حسن ہیں جنسِ وفا نہیں
لیکن جہاں میں عشق کی دولت کو کیا ہُوا

آتی ہے یاد روز، خود آتی نہیں مگر
یا رب! ہماری شامِ مسرّت کو کیا ہُوا

وقتِ وداع زرد ہُوا رنگِ رُخ اگر
رنگ و بہارِ عارضِ فطرت کو کیا ہُوا

تھی ہم کو عقل سے تو نہ پہلے ہی کچھ اُمید
نیرؔ جنوں کے فیض و کرامت کو کیا ہُوا

غزل

میں اُن حسین نظاروں کے پاس آ نہ سکا
خزاں نصیب، بہاروں کے پاس آ نہ سکا

رہا فلک پہ ستاروں میں جلوہ گرِ مہتاب
وہ اپنے سینہ فگاروں کے پاس آ نہ سکا

تمام عُمر رہا ہمکنار موجوں سے
سفینہ اپنا کناروں کے پاس آ نہ سکا

گدائے عِشق کی دولت تھی فقر و استغنا
وہ مال و زر کے سہاروں کے پاس آ نہ سکا

جہاں میں عام غمِ روزگار تھا نیّرؔ
مگر وہ عِشق کے ماروں کے پاس آ نہ سکا

غزل

بہارِ صبح نے گُل کو رُلا کے چھوڑ دیا
شرابِ ناب کو شبنم بنا کے چھوڑ دیا

کوئی بتائے کہ اُس ناخدا کو کیا کہیئے
سفینہ جس نے بھنور میں پھنسا کے چھوڑ دیا

وہ سخت جاں ہوں کہ جب کامیاب ہو نہ سکی
تری جفا نے مجھے آزما کے چھوڑ دیا

تری نظر کی بہار آفرینیوں کے نثار
کہ زخمِ دل کو گُلِ تر بنا کے چھوڑ دیا

ستم ہے تیری جفائے وفا نما کہ مجھے
جفا و جور کا خُوگر بنا کے چھوڑ دیا

وہی ہے زمزمہ پیرا دلوں میں اے بہتر
جسے نصیب نے شاعر بنا کے چھوڑ دیا

غزل

حسرتِ پیہم سے دِل تنگ آگیا
بس ہجومِ آرزو! گھبرا گیا

فصلِ گل کی طرح آیا تھا شباب
دِل کو آدابِ جنوں سکھلا گیا

سبزۂ و گل جھومتے ہیں باغ میں
وہ چمن پر نشّہ بن کر چھا گیا

جس کی لَے پر رقص میں ہے کائنات
کون دیوانہ وہ نغمہ گا گیا

مجھ سے تو بیزار تھا سارا جہاں
میں غم و آلام کو کیوں بھا گیا

بوئے زلفِ مشک بار آنے لگی
دیکھ نیّر شہرِ جاناں آگیا

غزل

بادہ تری آنکھ کی کرامات
توبہ مرے زُہد کی خرافات

ساغر نے سبُو سے کی ملاقات
کھولا گیا دفترِ حکایات

شبنم کو ترس رہے ہیں غنچے
کانٹوں پہ برس رہی ہے برسات

میخانے نے رنگ روپ بدلا
پاکر کسی آنکھ کے اشارات

پھر دَرد نے لی اک اور کروٹ
پھر زلفِ دوتا نے کی مدارات

پھر بربطِ شاخِ گل چمن میں
دیپک کے سنا رہی ہے نغمات

بیٹھا ہوں قفس میں سر چھپا کر
ڈرتا ہوں کہ دیکھ لے نہ برسات

کی گریہ نے لاکھ آبیاری
بدلیں نہ خزاں نے اپنی عادات

میخانے میں صبح و شام ہیں ایک
میخانے میں رات دن ہے دن رات

لاتا ہے جنوں پیام ہر سال
زندہ ہیں بہار کی روایات

تھا گنگ و جمن کی وادیوں میں
اک نشۂ عالمِ خرابات

موسم کے وہ مست مست اشارے
اللہ رے، شوخیٔ کنایات!

تو رُوحِ قدس کا ہمنوا ہے
نیّرؔ تری شاعری کی کیا بات

غزل

دل و نظر کے لئے لطفِ ناگہاں بن کر
جوانی آئی، تھی اِک خوابِ رائیگاں بن کر

وہ شاخِ گُل ہمیں اکثر قفس میں یاد آئی
جو نذرِ برق ہوئی سقفِ آشیاں بن کر

وہ گیت مطربِ آتش نوا سنا مجھ کو
جو آ سکے لبِ عشاق پر فغاں بن کر

جو آج تک کسی اسلوب سے بیاں نہ ہوا
وہ راز آج کھلا ان کی داستاں بن کر

نہ رہنما ہے، نہ منزل، نہ راہ اے نیّر
یہ لوگ چل دیئے کس سمت کارواں بن کر

غزل

کس کی محفل سے لئے کیفِ نظر جاتا ہوں
ساتھ جاتا ہے پری خانہ جدھر جاتا ہوں

مجھ کو اللہ کے بندوں نے دیئے ہیں وہ فریب
نام سنتا ہوں جب اللہ کا ڈر جاتا ہوں

اب بھی اک کوچے سے وابستہ ہے اک تلخ سی یاد
اب بھی اک راہ سے بھولے سے گزر جاتا ہوں

جب سے اِک حُسن یگانہ کی نظر ہے مجھ پر
سب ہیں یکتا نظر آتا ہوں جدھر جاتا ہوں

مَیں ہوں وہ نغمۂ رنگیں کہ بسانِ نکہت
وادیٔ سنبل و ریحاں میں بکھر جاتا ہوں

نگہِ یار تری شانِ تلوّن کے نثار
ہے ہر اک سمت نیا رنگ جدھر جاتا ہوں

لہلہائے گا ہمیشہ یہ گلستاں نیّر
مَیں یہاں چھوڑ کے وہ نغمۂ تر جاتا ہوں

غزل

میرا سرِ نیاز کہاں، تیرا در کہاں؟
میں آ گیا بحکمِ قضا و قدر کہاں؟

برسا دیئے ہیں آنکھ نے لعل و گہر کہاں!
پہنچی کہاں سے قیمتِ دامانِ تر کہاں!

اُس در کو مہر و مہ کے بھی سجدے نہیں قبول
آ کر ستارہ بار ہوئی چشمِ تر کہاں!

آنے لگا تھا طولِ شبِ ہجر میں مزہ
عمرِ عزیز ہونے لگی مختصر کہاں!

جس سے چمن کی نیند ہوئی تھی کبھی حرام
اب وہ نوائے بلبلِ شوریدہ سر کہاں!

نیّر یہ وقت ابر کی صورت ہے تیز گام
پھر یہ چمن کہاں، یہ نسیمِ سحر کہاں!

غزل

شبِ سرشک کی اک یادگار بھی تو نہیں
اب اک ستارۂ شبِ زندہ دار بھی تو نہیں
نگاہِ دوست تری ناوک افگنی کے نثار
لگا وہ تیر جو سینے کے پار بھی تو نہیں
ہوا کے دوش پہ تھا قافلہ امیدوں کا
نشانِ پائے سرِ رہگزار بھی تو نہیں
کسی کے لطف و کرم نے بھلا دیا سب کچھ
کہ یاد اب ستمِ روزگار بھی تو نہیں
جنوں کو سطوتِ سلطاں خراج دیتی ہے
جنوں کے پاس گریباں کا تار بھی تو نہیں
کہیں یہ قصرِ تمنا نہ منہدم ہو جائے
نگاہِ لطف ترا اعتبار بھی تو نہیں
کچھ اس طرح سے دواں ہیں سبک روانِ بہار
جلو میں گردِ سرِ رہگزار بھی تو نہیں

ستم، کہ اٹھ گئے محفل سے تیرے دیوانے
فغاں، کہ فطرتِ دیوانہ کار بھی تو نہیں

دلِ شکستہ کو مایوسیوں نے دی تسکیں
کہ اب فریبِ شبِ انتظار بھی تو نہیں

گنہ، گناہ سہی لذتِ گناہ نہ پوچھ
کہ دل گناہ سے اب شرمسار بھی تو نہیں

شریکِ غم، غمِ پروانہ میں ہیں پروانے
دلِ شکستہ کا اک سوگوار بھی تو نہیں

بجا کہ ہم کو نہیں آج فرصتِ غمِ عشق
جہانِ عشق کا وہ کاروبار بھی تو نہیں

فسانۂ ستمِ آشنا کہوں کس سے؟
دیارِ غیر میں اک رازدار بھی تو نہیں

کچھ اس مزے سے اسیری کے دن کٹے نیرؔ
کہ یاد آج وہ لیل و نہار بھی تو نہیں۔

غزل

رہی فطرت کو اک گُل پیرہن کی آرزو برسوں
صبا پھرتی رہی ہے کر متاعِ رنگ و بُو برسوں،

نگاہِ شوق نے بھی مدّعا دل کا نہ سمجھایا
ہُوا شرمندۂ معنی نہ حرفِ آرزو برسوں

چراغِ لالہ و گل سے اگر گلشن کو جلنا تھا
تو کیوں کلیوں کو اکساتا رہا ذوقِ نمو برسوں

لبوں پر آہ تھی اور دل میں نامعلوم سی شے تھی
رہے ہم ابتدا میں یوں رہینِ آرزو برسوں

بہشتِ گوش ہے پازیبِ زنداں کی صدا اب تک
رہا ہے حلقۂ طوقِ ستم زیبِ گلو برسوں

صبا لائی نہ کنعاں تک بہارِ بوئے پیراہن
یہ کیا کرتی رہی کم بخت پھرتی کُو بکُو برسوں

وہ راتیں وہ ملاقاتیں، وہ منصوری کی برساتیں
رہے گی یاد دل کو وہ بہشتِ رنگ و بُو برسوں

جنوں کی راہ میں وہ منزلیں خود آ گئیں نیّر
خرد کرتی رہی جن کی جہاں میں جستجو برسوں

غزل

تڑپ کر خاک پر جب کروٹیں بسمل بدلتے ہیں
تو دستورِ نظامِ بزمِ آب و گِل بدلتے ہیں

بہارِ لالہ و گل چھا رہی ہو جس کے ویرانوں پر
ہم اُس وادی سے قصرِ آسماں منزل بدلتے ہیں

بہشتِ مہر و الفت خیمہ زن ہو جس کے گوشے میں
ہم اک ایماں زدہ دل سے وہ کافر دل بدلتے ہیں

عجب کیا ہے کہ بدلیں عہدِ نو میں ہم مقام اپنا
کہ دریا بھی بھری برسات میں ساحل بدلتے ہیں

کلیسا کی طرح پیدا ہُوا ذوقِ صنم سازی
حرم والے بھی اب رسم و رہِ منزل بدلتے ہیں

نہیں اُترے جو دریا میں نہیں کھیلے جو موجوں سے
کبھی کشتی بدلتے ہیں، کبھی ساحل بدلتے ہیں

بنا لو تم چمن، ہم اس کو پھر صحرا بنا دیں گے
کہیں اس طرح دیوانوں کے مستقبل بدلتے ہیں

نہیں بدلی شہیدانِ وفا نے اپنی خو نیّرؔ!
نئے خنجر، نئے مقتل، نئے قاتل بدلتے ہیں

غزل

مجھ کو مسافرت کے مصائب کا غم نہیں
اپنے وطن میں بھی مَیں مسافر سے کم نہیں

دِل پھر بھی دے رہا ہے نظر کو فریبِ عشق
ہر چند دل پہ اُن کی نگاہِ کرم نہیں

اب سر کو خاکِ کوئے ملامت کی ہے تلاش
اَب دل میں آرزوئے طوافِ حرم نہیں

اُس شاخ کو بجبر جھکاتے ہیں باغ میں
گلچیں کے سامنے جو عقیدت سے خم نہیں

ڈرتا ہوں رازِ عشق نہ ہو محفل آشکار
روتا ہوں زار زار مگر آنکھ نم نہیں

وہ شوخیٔ شباب ہے یہ ہے شعارِ عشق
تم سے کسی کو شکوۂ جور و ستم نہیں

سودا اگر ہے سر میں تو دیوار بھی ہے پاس
زندانیوں کی وحشتِ دل پھر بھی کم نہیں

اٹھا اور اٹھ کے دشت و بیاباں میں رہ گیا
اہلِ چمن پہ ابر کی چشمِ کرم نہیں

دل کو دیا ہے لذّتِ احساس نے فریب
نیّر متاعِ رنج و الم بیش و کم نہیں

غزل

واحسرتا کہ آہ و فغاں میں اثر نہیں
اُن کو صدائے نالۂ دل کی خبر نہیں

تر ہو گیا ہے گریۂ شبنم سے آشیاں
اب آشیاں کو آگ کے شعلوں کا ڈر نہیں

روتا ہوں شب کو ترکِ تعلق کے بعد بھی
ہر چند اب وہ لطفِ فغانِ سحر نہیں

ایسا بھی ایک پھول بہشتِ حرم میں ہے
جس تک پیامِ بادِ صبا کا گزر نہیں

ہر بام و در پہ یوں تو چمکتے ہیں مہر و ماہ
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں یہ وہ بام و در نہیں

لے آئی کس کی بزم میں دیوانگیٔ شوق
روتا ہوں زار زار، مگر آنکھ تر نہیں

کیفِ بہارِ وادیٔ گنگ و جمن نہ پوچھ!
نیّرؔ کہیں وہ کیفِ بہارِ نظر نہیں

غزل

جب نقابِ رخِ زیبا وہ اٹھا دیتے ہیں
دلِ ہر ذرّہ کو آئینہ بنا دیتے ہیں

رُوح کو سوز دیا داغ جگر کو بخشا
حضرتِ عشق عجب دادِ سخا دیتے ہیں،

صبحدم صحنِ گلستاں میں صبا کے جھونکے
آتشِ دردِ محبّت کو ہوا دیتے ہیں

اب بھی اِک غیرتِ ناہید کے نغمے اکثر
عمرِ رفتہ کو مری مجھ سے ملا دیتے ہیں

نسیمؔ زار کی قسمت بھی جگاتے جاتے
آپ سوئے ہوئے فتنے تو جگا دیتے ہیں

غزل

سوادِ زلف پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو
جہانِ عشق پشیماں ہے دیکھئے کیا ہو

بہارِ لالہ پھر ارزاں ہے دیکھئے کیا ہو
قدم قدم پہ چراغاں ہے دیکھئے کیا ہو

جنوں خرد کا نگہباں ہے دیکھئے کیا ہو
پھر آمد آمدِ طوفاں ہے دیکھئے کیا ہو

چمن میں صبحِ بہاراں کا شور تھا لیکن
سکوتِ شامِ غریباں ہے دیکھئے کیا ہو

شفق میں ڈوب رہا ہے بہار کا دامن
بہار شعلہ بداماں ہے دیکھئے کیا ہو

گلیمِ کہنہ زہد و ورع کی خیر نہیں
جنوں پہ عہدِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

سحر ہوئی کہ ہر اک شاخِ لالہ زارِ وطن
صبا کی موج سے لرزاں ہے دیکھئے کیا ہو

نگاہِ اہلِ قفس جانبِ چمن اُٹھی
پریدہ رنگِ گلستاں ہے دیکھئے کیا ہو

چراغِ شامِ غریباں بجھا رہی ہے صبا
عجیب جشنِ بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

ابھی تو لا کے سجائے تھے شاخ پر تنکے
ابھی سے برق پرافشاں ہے دیکھئے کیا ہو

گزر گیا تھا زمانہ انہیں بھلائے ہوئے
پھر اشکِ خوں سرِ مژگاں ہے دیکھئے کیا ہو

اِدھر جنوں کا تقاضا اُدھر حیا کا لحاظ
عجب کشاکشِ داماں ہے دیکھئے کیا ہو

بہار رقص میں ہے، لالہ زار رقص میں ہے
وہ سروِ حسن خراماں ہے دیکھئے کیا ہو

جہاں سے رسم و رہِ دوستی اٹھی نیّرؔ
یہاں جو ہے وہ مسلماں ہے دیکھئے کیا ہو

غزل

ہو چکی رسوائے عالم چاک دامانی مری!
اب چمن میں رنگ لائے گی غزل خوانی مری

عشق کے انوار سے ہو جائیں گے دل تابناک
انجمن افروز ہو گی شمعِ عرفانی مری

چاک ہوں گے میرے سوز و ساز سے غنچوں کے دل
گُل کھلائے گی چمن میں لالہ سامانی مری

بلبلوں کو یاد آ جائے گی رودادِ بہار
دِل کو تڑپائے گی اے نیّرؔ غزل خوانی مری

غزل

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے
عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے

پلکوں پہ مچل رہے ہیں انجم
کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے

آ جاؤ کہ ایک بار ہنس لیں
"رونے کو تو زندگی پڑی ہے"

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیّرؔ کو سلامِ غم مبارک
منزلِ غمِ عشق اک کڑی ہے

غزل

سوئے رات کو روتے روتے اُٹھ بیٹھے پھر سوتے سوتے
کاش وہ زیبِ بالیں ہوتے ہم چونک اُٹھتے سوتے سوتے
ختم ہوا افسانہ ہستی ہنستے ہنستے روتے روتے
بیت چلی برسات بھی آخر کاٹ دیں راتیں روتے روتے
تیری یاد میں او پردیسی! عمر گنوا دی روتے روتے
سوکھ گئیں آشاؤں کی کلیاں فیضِ بہاراں ہوتے ہوتے

شور ہے ہر سُو بیّر بیّر
ہو گئے چرچے ہوتے ہوتے

غزل

پھر وہی ہم وہی تنہائی ہے
جس کا ڈر تھا وہی رات آئی ہے

آئنہ ہے کہ تماشائی ہے
کیا تماشا تری رعنائی ہے

اللہ اللہ، کششِ دشتِ جنوں
دلِ ہر ذرہ میں لیلائی ہے

خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار
نکہت و نور کو نیند آئی ہے

عقل رسوا تھی مگر اب نیّرؔ
عشق و مستی کی بھی رسوائی ہے

غزل

جہانِ تیرہ کی تاریکیاں مٹا کے چلے
فروغِ بادہ سے محفل کو جگمگا کے چلے

سما سکے نہ دلِ کائنات میں لیکن
یہ کم ہے کیا کہ نظر میں تری سما کے چلے

وہ دل کہ جس سے شبِ غم کا نام روشن تھا
وہ اُس کو مثلِ چراغِ سحر بجھا کے چلے

بفیضِ نغمۂ جاں بخش و جامِ روح نواز
بڑھی نہ عمر، تو عمرِ طرب بڑھا کے چلے

نہ ڈھا سکے گا اُسے تیشۂ فریبِ خرد
قلندرانِ طریقت جو گھر بنا کے چلے

ابھی تو حدِّ نظر ہے جہانِ انجم و ماہ
سمندِ شوق سے کہہ دو قدم بڑھا کے چلے

دلِ جہاں میں وہی شعلہ بن کے تیر گیا
جو گیت اہلِ وفا سازِ دل پہ گا کے چلے

سنا کسی نے نہ سازِ شکستِ رنگِ بہار
بس اک ہمیں دلِ ناداں پہ چوٹ کھا کے چلے

نہ بھولنا ہمیں اے کوئے مشکبوئے حبیب!
متاعِ صبر و سکوں ہم یہاں لٹا کے چلے

غزل کے رنگ میں نیّر فسانۂ غمِ عشق
سمجھ میں خود نہیں آیا مگر سنا کے چلے

غزل

تھکے نہ اہلِ طلب عرضِ مدعا کرتے
پہونچ گئے تری سرکار میں صدا کرتے

کچھ اس ادا سے اٹھی سوئے دل نگاہِ ستم
کہ رہ گئے گلۂ جورِ ناروا کرتے

خدا نے ذوقِ گنہ بے حساب بخشا تھا
گناہگار حسابِ گناہ کیا کرتے

جلائے وادیٔ غربت میں جگنوؤں کے چراغ
برائے جشنِ بہاراں ہم اور کیا کرتے؟

متاعِ درد کی قیمت ہے دہر میں ببّر
جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کو کیا کرتے؟

غزل

بہارِ باغ رخصت ہو رہی ہے
خزاں گلشن میں کانٹے بو رہی ہے

جفا نے پھونک ڈالا خرمنِ زیست
وفا کشتِ تمنّا بو رہی ہے

حقیقت جتنی اُلجھائی گئی تھی
اب اُتنی ہی فسانہ ہو رہی ہے

زمانے کی شکایت کر رہا ہوں
ترے غم کی حکایت ہو رہی ہے

سحر آئی، مئے شبنم سے نیّر
چمن کی ہر کلی منہ دھو رہی ہے

غزل

آنکھوں میں سمائے جاتے ہیں نیندوں پہ چھائے جاتے ہیں
میں لاکھ بھلاتا ہوں ان کو وہ سامنے آئے جاتے ہیں

شبنم کے آنسو کہتے تھے پھولوں کے عارض پہ بہہ کر
اِس دنیا میں جو ہنستے ہیں آخر وہ رُلائے جاتے ہیں

طغیانِ سرشکِ حسرت سے شاید کچھ غم کی پیاس بجھے
گھُٹ گھُٹ کے نوڑے سے آنسو اور آگ لگائے جاتے ہیں

بلبل کے فسانے سنتا ہوں قمری کے ترانے سنتا ہوں
سنتے ہیں کہ دل والوں ہی کو یہ راگ سنائے جاتے ہیں

اس مکر و ریا کی دنیا میں معیارِ شرافت کچھ بھی نہیں
انسان مٹائے جاتے ہیں شیطان بنائے جاتے ہیں

ہستی کے ظلمت خانے پر چھائی تھی ہر سُو تاریکی
ہم اپنے چھلکتے اشکوں کے فانوس جلائے جاتے ہیں

بیمارِ غمِ ہجراں کے لئے دردِ غمِ فرقت راحت ہے
یہ پوچھنے والے اے نیّر کیوں جان کو کھائے جاتے ہیں

غزل

ادائے خاص سے دیکھا عطائے جام سے پہلے
ہُوا ساقی کا لطفِ خاص لطفِ عام سے پہلے

دمِ توبہ یہ حکمِ مفتیٔ ابرِ بہار آیا
شکستِ توبہ لازم ہے شکستِ جام سے پہلے

ابھی تک یاد ہے دنیا کو افسانہ محبت کا
ابھی تک اُن کا نام آتا ہے میرے نام سے پہلے

کسے معلوم پھر کب دن پھریں ابرِ بہاراں کے
تم آجاؤ بہارِ ابر کے ہنگام سے پہلے

میں ناواقف نہیں صیاد کے انجام سے لیکن
چمن ہی لُٹ گیا صیاد کے انجام سے پہلے

تعالیٰ اللہ کیا رتبہ ہے راہِ عشق کا نیّرؔ
فرشتے سجدہ کرتے ہیں یہاں ہر گام سے پہلے

غزل

پھر چشمِ فلک سوئے گلستاں تو نہیں ہے
بے وجہ یہ طوفانِ بہاراں تو نہیں ہے

شاخوں پہ بہار آئی ہُوا جشنِ چراغاں
یا شاہدِ گل شعلہ بداماں تو نہیں ہے

کچھ کم بھی نہیں گوشۂ زنداں سے مجھے گھر
ہر چند کہ گھر گوشۂ زنداں تو نہیں ہے

گلرنگ ہے دامانِ شفق گریۂ خوں سے
یہ صبحِ وطن شامِ غریباں تو نہیں ہے؟

شبنم کی جگہ اشک ہیں لالے کی جگہ دل
نیّرؔ یہ محبت کا گلستاں تو نہیں ہے

غزل

شہرِ ازمیر دیکھتا ہوں میں ایک تصویر دیکھتا ہوں میں
خواب دیکھا تھا اک جوانی میں اُس کی تعبیر دیکھتا ہوں میں
مہ جبینوں کے خطِّ ابرو میں غزلِ میرؔ دیکھتا ہوں میں
تھی تصوّر میں جلوہ گر جو بہشت اُس کی تصویر دیکھتا ہوں میں

نشّۂ آبِ برگمآ مت پوچھ
مے کی تاثیر دیکھتا ہوں میں

ازمیر
(۱۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء)

مئے باقی

مئے باقی

"مئے باقی" کے زیرِ عنوان وہ نظمیں عرض کی جا رہی ہیں، جو ۱۹۵۹ء کے بعد لکھی گئیں۔ اور پہلی اشاعت میں شامل نہ تھیں۔ ان میں غزل کے نام سے ایک "فغانِ دلِ حزیں" "سلام" اور "طلائی جلوہ گاہ" اس وقت لکھی گئیں جب کہ راقم الحروف ۱۹۶۶ء میں پہلی بار حج بیت اللہ کے لئے حجاز مقدس پہنچا۔ یہ تینوں نظمیں جگہ کی مناسبت سے "محرابِ حرم" میں شامل کر دی گئی ہیں "چشمہ اور سمندر" اور "مرگِ آرزو" کے عنوانوں سے دو نظمیں اردو میں اس وقت منتقل کی گئیں جب کہ پنجاب یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کا ایک امتحان ۱۹۶۱ء میں دے لیا۔

ایک نظم لعلِ لبِ ترکانِ شیراز سے متعلق ہے جو شیراز میں ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی۔ دوسری نظم میں "زلفِ پری رویانِ بنگال" کا ذکرِ خیر ہے۔ جو نومبر ۱۹۶۶ء میں مشرقی پاکستان کے حسین سمندر کے ساحل کی بستی "کاکس بازار" میں کہی۔ ایک تیسری نظم غزل کی صورت میں مہ جبینانِ سمرنا کے خطِ ابرو کے بیان پر مشتمل ہے۔ جو ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو سمرنا (ازمیر) میں ہو گئی اور دو شعر "یادِ وطن" سے متعلق ہیں جو ۱۴ نومبر ۱۹۶۳ء کو بابل کے کھنڈروں میں کہے۔ "گنبدِ خضرا کے سایہ میں" دو شعر اس وقت ارتجالاً ہو گئے۔ جب کہ راقم الحروف ۹ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو مسجدِ نبوی کے

سایہ میں ایک بار پھر پہنچا۔ "نالۂ دل" ۲۴ر نومبر ۱۹۶۳ء کو ہرات میں حضرت مولینا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکار میں پیش کیا۔ اور "نفیرِ عشق" کے نام سے نظم اس وقت لکھی جب کہ قونیہ میں ۲۲ر نومبر ۱۹۶۳ء کو حضرت مولینا جلال الدین رومی کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ اب یہ نظم مولینا کے مزار پر آویزاں ہے۔ اور گویا اُس کے ذریعہ ایک مریدِ مخلص کو اپنے مرشد کے دربار میں مستقل حضوری کا شرف حاصل ہے؛

نیّر واسطی

۲۰ر جنوری ۱۹۶۸ء

گنبدِ خضرا کے سایہ میں

تیری بستی رہے

میری مستی رہے

تیرا ڈیرا رہے

میرا پھیرا رہے

روضۃ النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

(مدینۂ منورہ)

۹ر اکتوبر ۱۹۶۵ء

نفیرِ عشق

بر مزارِ حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ

بشنو از من چوں شکایت می کنم
از نفیرِ نے حکایت می کنم

نالۂ دلگیرِ نے جانم بسوخت
کعبۂ پندارِ ایمانم بسوخت

صبر از دل رفت و دل بشکست درد
رخت سوئے شہرِ دلبر بست رفت

گل ز باغِ حسنِ او چیدن گرفت
در دیارِ عشق رقصیدن گرفت

خاکِ راہِ جادۂ رومیؒ شدم
مستِ جامِ بادۂ رومیؒ شدم

ہوش رفت از جامِ پیمانِ الست
نالہ گم شد در نیستانِ الست

در جگر سوزِ نہاں آوردہ ام
قونیہ را ارمغاں آوردہ ام

قونیہ ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۶۲ء

نالۂ دِل

بر مزار حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ

بیامد بر درِ جامیؒ گدائے فقیرے خستہ حالے بینوائے
بیامد تشنۂ بر سلسبیلے غریبے، سائلے، ابن السبیلے
زخاکِ پاک بہرِ دلستانے دلے بیتاب و چشمے خونفشانے
نوایش نالۂ دردآشنائے شکستِ شیشۂ دل را صدائے
دل از دیوانگی آوارۂ عشق جگر از سوز آتشپارۂ عشق
گدائے رہ نشینِ جادۂ جام زسر مستی خرابِ بادۂ جام
بصحرائے جنوں رختِ سفر بست زسر ہوش و زلب آہ و دل از دست
بہ رخ زرد و بہ سر خاکِ غریبی بہ لب قُم یا حبیبی یا حبیبی!

بر آمد از درونِ دل خروشم
کہ من دل را بجامِ تو فروشم

۲۴ر ستامبر ۱۹۶۴ء

نغمۂ عشق

داتاؒ کے حضور میں

مطربِ عشق عجب ساز و نوا رکھتا ہے
دل کے ہر پردے میں ہنگامہ بپا رکھتا ہے

عظمتِ فقر ہے ہر حال میں تابندہ جمال
لالۂ صحرا میں بھی شاہانہ قبا رکھتا ہے

صحنِ میخانہ کہ ہے مہبطِ انوارِ خدا
قبلۂ حاجت و محرابِ دعا رکھتا ہے

اللہ اللہ رے، فیضانِ درِ پیرِ مغاں
مستِ جامِ مئے اندوہ رُبا رکھتا ہے

شہرِ لاہور کہ ہے سجدہ گہِ اہلِ نظر
مردِ ہجویرؒ کا نقشِ کفِ پا رکھتا ہے

یادِ وطن

راقم الحروف جب نومبر ۱۹۶۲ء میں اردن۔ حجاز اور شام و لبنان کی وادیوں میں پھرتا پھراتا بغداد میں آکر مقیم ہو گیا تو ایک دن حلّہ۔ بابل اور ذوالکفل کے راستے کو نے کے لئے پیادہ پا چل پڑا تاکہ جی بھر کے اُس سرزمین کی زیارت کرسکے جس کا ہر چپہ اقوام و ملل اور بالخصوص اسلام کی تاریخ کا رنگین صفحہ ہے۔ راہ میں جب بابل کے کھنڈروں میں دیر تک گھومنے کے بعد ایک جگہ تھک کر بیٹھ گیا تو یکایک وطن یاد آیا اور اقبال کے ایک مصرع پر یہ دو شعر موزوں ہو گئے۔

آشفتہ سری میری لئے پھرتی ہے مجھ کو
میں رہ نہ سکا رسم و رہِ عام کا پابند
ایران میں ہوں آج تو توران میں ہوں کل
گھر میرا نہ دلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند

ایک عرب مجاہد کی تصویر دیکھکر

اے مجاہد رخِ اسلام کی تنویر ہے تو
یوسفستان کے حسین خواب کی تعبیر ہے تو
تیری آنکھوں سے برستا ہے وقارِ اسلام
تیرے دامن پہ مچلتی ہے بہارِ اسلام
تیرا ہر زخم گُلِ تازہ گلزارِ حیات
تیرا ہر قطرہ خوں غازہ رخسارِ حیات
تازہ ہے نیل کی موجوں کا ترانہ تجھ سے
زندہ ہے ضربتِ موسیٰؑ کا فسانہ تجھ سے
دہر میں فلسفہ عشق کی تفسیر ہے تو
جرعہ نوشِ مئے خمخانہ شبیرؑ ہے تو
تجھ کو رسم و رہِ تسلیم و رضا آتی ہے
مرنے والے! تجھے مرنے کی ادا آتی ہے

علیؓ مسجد میں چند قبائلیوں کو دیکھکر

وہ مسلماں جو صف آرا ہیں علی مسجد میں
اسد اللہؓ کے مہمان نظر آتے ہیں

دینِ اسلام کا پیغام ہے قرآنِ مجید
اور یہ قرآن کی بُرہان نظر آتے ہیں

اِن کا ہر قطرۂ خوں لالۂ گلزارِ حیات
جن سے روشن چمنستان نظر آتے ہیں

آج تک خونِ سے کرتے ہیں نمازوں میں وضو
رسم و آئیں کے نگہبان نظر آتے ہیں

جن میں اللہ کے شیروں کی اذاں گونجی ہے
یہ وہ خیبر کے کہستان نظر آتے ہیں

درۂ خیبر میں لکھی گئی

شیراز

زہے بوئے گل و ریحانِ شیراز　　خہے لعلِ لبِ تُرکانِ شیراز

نگارانش ز لب شکّر فروشند　　ز مژگاں دشنہ و خنجر فروشند

بہ رکناباد و گلگشتِ مصلّیٰ　　فضائے جلوۂ عرشِ معلّیٰ

برائے مستیٔ دیوانۂ عشق　　زلالش بادۂ خُمخانۂ عشق

ز سعدی رنگ و بویش در بہاراں　　خُمِ حافظ بہ بزمِ میگساراں

دلِ مہجور عاشق را مکانے　　بشہرِ دلبری کوئے فلانے

"خوشا شیراز و وضعِ بیمثالش
خداوندا نگہدار از زوالش"

شیراز ۵ جنوری ۱۹۶۳ء

ساقئ کوثر سے فریاد

حال ہے مشرق و مغرب کا خراب اے ساقی
تا کجا گنبدِ خضرا میں حجاب اے ساقی

دلِ مجروح کو ہے دستِ ستمگر سے گلہ
موج کے ہاتھ میں ہے جامِ حَباب اے ساقی

وادئ مصر میں ہر مسلمِ خستہ کا جگر
آتشِ غم سے ہُوا مثلِ کباب اے ساقی

گلشنِ شام میں ارزاں ہے مسلماں کا لہو
جس نے بخشا گل و لالہ کو شباب اے ساقی

درِ میخانۂ یعقوبؑ سے آتی ہے صدا
تیرے مستوں پہ ہوا بند یہ باب اے ساقی

شور ہے مسجدِ اقصیٰ کے نگہبانوں میں
بھیج دے حیدرِ کرّار کو میدانوں میں

چشمہ اور سمندر

وکٹر ھیوگو کی ایک نظم کا ترجمہ

فرانسیسی سے اُردو میں

ایک چشمہ قطرہ قطرہ پتھروں سے پھوٹ کر
گِر رہا تھا بحر میں اپنے وطن سے چھوٹ کر
دیکھ کر اُس کو سمندر نے حقارت سے کہا
اپنی بدبختی پہ رو کر مانگتا ہے مجھ سے کیا؟
مَیں ہوں اک خوفِ مجسّم، ایک طوفانِ بلا
دیکھ! گردوں کے کنارے تک ہے، میری انتہا
مَیں ہوں بحرِ بیکراں عالم میں ہر سُو میرا راج
مجھ کو ہو سکتی ہے کیا دنیا میں تیری احتیاج

اس تعلّی پر ترش رو ہو کے چشمے نے کہا
اے سمندر! تیرا یہ غرّہ نہیں ہرگز بجا
تو مرے لطف و کرم اور میری خاموشی کو دیکھ!
اپنے بیجا ناز اور احساں فراموشی کو دیکھ
مانتا ہوں ہر طرف دنیا میں تیرا راج ہے
تو مرے ایک ایک قطرے کا مگر محتاج ہے

مرگِ آرزو

(گوتی اے کی فرانسیسی نظم کا اردو ترجمہ)

جھیل سے کچھ فاصلے پر چشمۂ آبِ رواں
بہہ رہا تھا بن کے نالہ پتھروں کے درمیاں
جی میں کہتا تھا کہ جب زیرِ زمیں تھا میرا گھر
رنگ تھا میرا سیہ، پوشیدہ تھے میرے ہنر
اب مرا پانی ہے نیلا میری رنگت ہے حسیں
دیکھتا ہے میرے آئینے میں منہ چرخِ بریں
فارگیٹ می ناٹ[1] کے خوش رنگ نیلے نیلے پھول
کہتے ہیں مجھ سے کہ اے پیارے نہ جانا ہم کو بھول
تتلیاں رہتی ہیں رقصاں میرے آئینے کے پاس
میرے پیالے سے بجھاتے ہیں پرندے اپنی پیاس

[1] Forget me not

رفتہ رفتہ ایک دن بن جاؤں گا جوئے رواں
میرے پانی سے کریں گی غسل لاکھوں وادیاں
کشتیوں کو دور تک موجوں میں لیجاؤں گا میں
منزلِ مقصود تک انساں کو پہنچاؤں گا میں
جگمگائیں گے مری آغوش میں لاکھوں حباب
ضو فشاں جب اُن میں ہوگا عکسِ روئے آفتاب

مست چشمے کے ترنّم سے ٹپکتا تھا شباب
ننھے نظر کے سامنے رنگین امیدوں کے خواب
شور سے نالے کے تھا جوشِ تمنّا آشکار
موجِ مضطر سینۂ شفّاف میں تھی بیقرار

مہد سے پہونچی لحد تک زندگی کی داستاں
ہو گیا چشمے کا مستقبل سراسر بے نشاں
یعنی آبِ نیلگوں کی راہ میں جھیل آ گئی
نوجواں چشمے کے دل کی آرزو کو کھا گئی

کاکس بازار

تعالیٰ اللہ بہارِ کاکس بازار — پئے سودا دل و دیں را خریدار
زمینش اہلِ دل را قبلہ آرا — بپایش بحر ہر دم سجدہ فرسا
دلِ گم کردہ منزل را مکانے — جنونِ عشق ساماں را جہانے
گل و نسریں نثارِ خاکِ کویش — بہارِ بزمِ ہستی رنگ و بویش

زہے رنگ پری رویانِ بنگال
خہے بوئے سمن بویانِ بنگال

کاکس بازار۔ مشرقی پاکستان
(۲۵ مارچ ۱۹۶۶ء)

جوابِ مکتوب

بنام آقائے دکتر زرین کوب استاذِ دانشگاہ طہران

اے ادیبِ شہیرِ ملکِ عجم
عزّت و آبروئے دولتِ جم

فخرِ دانشورانِ طہرانی
شرفِ دودۂ خراسانی

مانیٔ نقشِ زرنگارِ ادب
بانیٔ خطِ رہگذارِ ادب

پرچم آرائے جاہ و سطوتِ علم
گوہر آمائے تاجِ عزتِ علم

تازہ از تو فسانۂ جم و کے
کشتیٔ شعرِ تو چو کشتیٔ مے

مئے شعرِ تو بادۂ الہام
بادۂ تو ز جامِ مرشدِ جامؒ

در سطورِ کلامِ تو مستور
حسنِ فیروزہ ہائے نیشاپور

لفظِ تو ہمچو لعلِ نورانی
لعلِ تو در صفت بدخشانی

نظمِ تو چادرِ خراسانی
نثرِ تو سرمۂ صفاہانی

یاد آں شب کہ شد ز فیضِ قدوم
منعقد محفلِ نجومِ علوم

از خمستانِ بوعلی سیناؒ ساقی آوردہ ساغر و مینا
آمد از باغ بلبلِ شیراز سنبل و لالہ و گلِ شیراز
کلبہ ام از رخت منوّر شد از شمیم تو جان معطّر شد
اے سراپا جمال، اے محبوب اے طبیبِ قلوب، زرّیں کوب

اے کہ بودی تو جانِ محفلِ ما
خانۂ تست گوشۂ دلِ ما

لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۶۴ء

خیر مقدم

"شعر و حکمت" کی اشاعت کے بعد برصغیر پاک و ہند کے بلند پایہ نقادوں اور موقر رسائل و جرائد نے اس پر جو گراں قدر تبصرے فرمائے تھے ذیل میں ان کے کچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

○

نقادانِ فن کے تاثرات

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور

حضرت نیر اپنے میلان کے اعتبار سے ایک رومانی شاعر ہیں۔ اور ان کی شاعری ایک لحاظ سے مشاہدات و واقعات کی شاعری ہے جس میں کاغان سے لیکر کراچی تک اور پاکستان سے لیکر مغرب کے ممالک تک ہر مناسب موقع کے تاثرات کو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔

نیر کی شاعری اس لحاظ سے ایک حیثیت کی مالک ہے کہ اس میں بہت سے رومانیوں کے مقابلے میں زندگی زیادہ ہے۔ نیر کی نظموں میں حریت اور آزادی کے جو احساسات ملتے ہیں ان سے ان کے کردار کے انفرادی نقوش بھی نمایاں ہیں۔ اور عقیدت اور محبت ان کا خاص رنگ ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں یکساں ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔

جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی

"شعر و حکمت" کا تحفہ میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ سبحان اللہ

ع ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کتاب بھر میں موضوع کوئی بھی ہو آمد ہی آمد ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ شاعری اسی کو کہتے ہیں۔ کلام کی ندرت اور شگفتہ نگاری و عذوبت قدم قدم پر وجد کا عالم طاری کرتی ہے۔ اِدھر کلام کی اشاریت ایک دنیائے معانی کی سیر کراتی ہے ؏

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

"شعر و حکمۃ" اُن کوتاہ بینوں کا دنداں شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ اردو شاعری انحطاط پذیر ہے۔

○

اَدبی مجلّات و رسائل کی آرا

○ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور "شعر و حکمۃ کے شاعر حکیم نیّر واسطی ادب دوست حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ آپ کی نظمیں بڑی جامع، مؤثر اور پاکیزہ ہیں جو مضامینِ حسن و عشق، مظاہرِ فطرت اور لطیف انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ غزلوں میں نیّر واسطی نے الفاظ کی نشست، تراکیب کی سجاوٹ اور بیان کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور وہ غزل کی روایات کے بڑے مزاج داں ہیں۔"

○ اورنٹیل کالج میگزین لاہور

"شعر و حکمۃ" حکیم نیّر واسطی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ نام کی ندرت موزونیت سے رشتہ بدامن ہے۔ حکیم صاحب شعراء کے اس قبیلے سے متعلق ہیں جو طب اور شاعری کو ہم رشتہ کرتے رہے ہیں اور زمانے نے شاعری اور حکمۃ دونوں میں ان کی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔ واقعات و مقامات سے دلبستگی جو زندگی سے محبت کی علامت ہے ان کو واقعات کا شاعر قرار دیتی ہے اور شعر و حکمۃ کا مقدمہ صحیح معنی میں تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں کا مصداق ہے۔"

○ ماہنامہ "آج کل" دہلی

"حکیم نیّر واسطی نظم ہو یا غزل فن کی پختگی کو کہیں نہیں چھوڑتے۔ "محراب حرم" کے عنوان سے متعلق بہت اچھی نظمیں اور نعتیں ہیں۔ نیّر ہی کا ایک شعر کلامِ نیّر کی بہترین

داد ہے کہ ؎

تو روحِ قدس کا ہمنوا ہے — نیرؔ تری شاعری کی کیا بات

○ ہفت روزہ "چٹان" لاہور

"حکیم نیرؔ واسطی نے ایک طبیب کے طور پر جو نام پایا اور جس بلندی پر پہنچے اس کے تذکرہ کا یہ محل نہیں۔ یہ بات خوفِ تردید کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ انہیں اپنے فن میں کمال حاصل ہے۔ وہ اپنے فن کے لئے سرمایۂ فخر ہیں مگر ان کا ادبی ذوق بھی ایک خاص مقام پر نکھر چکا ہے

حکیم صاحب کا کلام جب پہلے پہل ادبی صحائف و رسائل میں شائع ہوا تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ جو شخص تمام عمر طبی مشاغل میں مصروف رہا ہو ایسے اشعار کیسے کہہ لیتا ہے۔ جن میں رمِ آہو بھی ہے اور جوانی کی خوشبو بھی۔

شعر و حکمۃ میں نیرؔ واسطی اختر شیرانی مرحوم سے قدم ملا کے چلتے ہیں جس کا انہیں خود اعتراف ہے۔ ان کی مینائے سخن میں ہر طرح کی شراب موجود ہے نظم کو نظم کی سطح پر رکھتے اور غزل کو غزل کے مقام سے صدا دیتے ہیں۔ قومی نظمیں لکھتے وقت ان کا لہجہ بالکل اقبالؒ، ظفر علیؒ، حالیؒ اور شبلیؒ کا سا ہو جاتا ہے اور جب کسی دوست کا مرثیہ لکھتے ہیں تو اس میں واضح طور پر آنسوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

صبح بنارس، کاغان کے نظارے، مری، بار دیگر، ہائے کراچی، بنانِ لبنان شامِ دمشق، مارگریٹ، وادیٔ نیل نہایت موثر اور دلگداز نظمیں ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کے فنی کمال کا اندازہ ہوتا ہے، رہا زبان کا معاملہ اور بیان کا مسئلہ، تو یہ گویا ان کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی ہیں۔"

○ ہفت روزہ "قندیل" لاہور

"شعر و حکمۃ کے مصنف حکیم نیرؔ واسطی کا شمار ملک کے بلند پایہ شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب شعر و حکمۃ کے دیباچہ میں "حکایتِ جنوں" کے زیرِ عنوان قریب نصف صدی کے شعری ادب کی تاریخ سمو دی ہے۔ آخری حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جو حکیم صاحب کی شاعرانہ عظمت اور شعری بلوغت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ کتاب ہمارے اردو ادب میں ایک قابلِ قدر

اضافہ ہے۔ شعر و حکمۃ حکیم نیرؔ واسطی کی ایک منظوم زندگی ہے۔ ایسی زندگی جسے خود حکیم صاحب نے مختلف حادثوں کی تخلیق کہا ہے۔"

○ ماہنامہ "بانگِ سحر" سیالکوٹ

جناب منظور احمد صاحب بھٹی نے "بانگ سحر" میں شعر و حکمۃ پر تقریباً پانچ صفحات میں تبصرہ سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں آپ رقمطراز ہیں کہ "حکیم نیرؔ واسطی اس دور کے جانے پہچانے شاعر ہیں اور ان کی شاعری ادبِ جدید و قدیم کے امتزاج کا حسین مجموعہ ہے اور ان کی کتاب شعر و حکمۃ ہمارے شعری ادب میں ایک حسین اضافہ ہے جسے نہایت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔"

○ مجلہ معاشرتی بہبود لاہور

جناب پیام صاحب شاہجہانپوری مدیر "معاشرتی بہبود" نے تقریباً تین صفحات میں شعر و حکمۃ پر تبصرہ فرمایا ہے جس میں آپ لکھتے ہیں کہ "ہمارے ملک کے مشہور طبیب حکیم نیرؔ واسطی طب العرب اور ترکی نظامِ طب کی تاریخ جیسی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہلے سے ممتاز تھے ہی۔ اب شعر و حکمۃ کی اشاعت کے بعد عام قارئین بھی آپ کی شاعرانہ اور ادبی عظمت سے روشناس ہوں گے۔

شعر و حکمۃ کا ایک اہم باب اس کتاب کا مقدمہ ہے جس سے حکیم صاحب کی شاعری کا سارا پس منظر سامنے آجاتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مقدمہ ان کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہونے اور ان کی شاعری کے پس منظر کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ غیر منقسم ہندوستان کے چالیس سالہ ادبی اور تہذیبی دور کی تاریخی دستاویز بھی ہے جسے انہوں نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

"محرابِ حرم" کے زیرِ عنوان نیرؔ واسطی کی نعتیں اور نظمیں دیکھنے کے بعد اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ضعفِ شعر کے جملہ لوازمات اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں ہدیۂ نیاز پیش کیا ہے۔ یادِ رفتگاں، نیرنگیش اور اشارات کے زیرِ عنوان نظموں کو دیکھ کر جن کا تعلق زیادہ تر وارداتِ قلب اور لطیف احساسات سے ہے قطعی طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب

ممدوح اس رومانی اسکول کے بانیوں میں سے ہیں جس کی بنیاد اختر شیرانی کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اور جس کی بنیاد رکھنے میں حکیم صاحب ممدوح نے اپنے فن کے ذریعہ ان کا پوری طرح ہاتھ بٹایا۔

رومانی نظموں میں "مری اُوڑھائے کراچی" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ نظمیں جوشِ بیان کے اعتبار سے زندۂ جاوید رہیں گی۔ "حکایت لذیذ" میں "نذر مارگریٹ" اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور ہر غزل کا ہر شعر ایک مرصع غزل اور احساسات کی شدت کا آئینہ دار ہے"

○ ماہنامہ "شمع ادب" سلطان پور (یو۔پی)

جو حضرت فراق گورکھپوری کی زیر سرپرستی سلطان پور سے نکلتا ہے لکھتا ہے کہ۔ "چونکہ نیر واسطی کے پہلو میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے اس لئے وہ زندگی کے ہر نشیب فراز اور وقت کے ہر اتار چڑھاؤ سے بہت جلد متاثر نظر آتے ہیں۔ آپ کی کتاب شعر و حکمۃ کی نظموں میں عام طور پر حقیقت پسندی اور واقعات نگاری کی ایسی جھلک پائی جاتی ہے جس میں مصنف کا ایک مخصوص رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس مخصوص رنگ کے اجزائے ترکیبی اختر، اقبال اور جوش ہیں۔ شاعر کی فطری ذہانت اور شاعرانہ جودت نے اس حسین امتزاج سے اپنے لئے ایک منفرد رنگ بنانے کی کوشش کی ہے جو یقیناً قابل داد ہے۔"

○ ماہنامہ "تجلی" دیوبند

جناب نیر واسطی ایک جانے پہچانے کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا مجموعۂ کلام شعر و حکمۃ، شعر و ادب کے خزانے میں ایک وقیع اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کا مقدمہ "حکایت جنوں" کے عنوان سے شاعر کی زندگی کا پورا خاکہ پیش کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتدیانہ شاعری بھی بڑی حد تک خامیوں سے پاک رہی ہے۔

نیر صاحب کی شاعری سنجیدگی اور شوخی کا ایک خوبصورت سنگم ہے جس میں ان کی پختہ کلامی کے خد و خال نظر آتے ہیں۔ رومان ان کی طبیعت کا خاص رجحان ہے اور اس کی جھلکیاں ان کے یہاں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ حسن اور نغمگی، نکھار اور رچاؤ، فن اور معنویت

سبھی کچھ ہے ان کے کلام ہیں۔ اور حاصلِ تبصرہ یہ ہے کہ شعر و حکمت کا وقیع و بیش قیمت ہونا بے ریب ہے اور نیرؔ صاحب بالیقین اچھے شاعر ہیں۔"

○ ماہنامہ" تعمیرِ انسانیت" لاہور

نیرؔ صاحب ملک کے مشہور طبیب اور بلند پایہ شاعر ہیں اور آپ کی کتاب شعر و حکمۃ کا مقدمہ بیحد دلچسپ اور نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے اور آپ کے کلام میں نہایت روانی دلکشی اور منظر کشی پائی جاتی ہے"

○ ماہنامہ" فاران" کراچی

جناب حکیم نیرؔ واسطی کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے وہ عربی کے عالم ہیں، طبیبِ حاذق ہیں۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی کے علاوہ ترکی بھی جانتے ہیں۔ طب العرب کے مؤلف و مترجم ہیں اور ساتھ ہی ایک نغز گو شاعر بھی ہیں۔ اپنے اس مجموعۂ کلام کا مقدمہ خود آپ نے لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نثر نگاری کی بڑی اچھی صلاحیت موجود ہے۔ اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھنا بہت ہی مشکل اور نازک مرحلہ ہے مگر نیرؔ صاحب نے اس منزل کو بڑی خوبی سے سر کیا ہے۔

حکیم نیرؔ واسطی کی رومانی نظموں میں خاصی روانی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ مناظر کی عکاسی بھی انہوں نے بہت خوب کی ہے۔ جس وادی میں ان کا توسنِ خیال نکل گیا ہے، پھول بکھیرتا ہوا گیا ہے اس کے برخلاف قومی نظموں میں سنجیدگی اور تقدسِ فکر جھلکتی ہے۔"

○ ماہنامہ" مہرِ نیمروز" کراچی

"حضرتِ نیرؔ طبیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ادیب بھی ہیں اور سیاح بھی۔ شعر و حکمۃ کے شروع میں جو مقدمہ آپ نے لکھا ہے وہ ان کی زندگی کی بڑی رواں دواں اور دلکش کہانی ہے۔ شعر و حکمۃ کی بہت سی نظمیں وقتی حوادث و واقعات پر مبنی ہیں لیکن کہنہ مشقی، ریاضت اور اصولِ فن کا ہی تو کمال ہے کہ وقتی حوادث و واقعات بھی کیف جاودانی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

آج کل فطری شاعر کی اصطلاح نے یہ خیال عام کر دیا ہے کہ فطری شاعر کو کسی تعلیم و تربیت اور مشق و ریاضت کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کو شعر و حکمۃ سے فائدہ پہنچے گا کہ دل کی باتیں لطافت کے ساتھ کس کس طرح بیان کی جاسکتی ہیں۔ دورِ جدید کے طوفان میں حضرتِ نیرؔ نے

شعر و حکمۃ کی زبان و ادا کو بڑی کامیاب حد تک لطافت کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ ان کے کلام میں کیف و اثر کا اصل راز یہی ہے۔"

○ ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد دکن

"شعر و حکمۃ کا مقدمہ کافی پُرلطف اور معلومات آفریں ہے نظمیں موقعتی ہیں جن میں سے اکثر کی شانِ نزول شاؔ، نے مقدمہ میں دے دی ہے۔ مقدمہ پڑھنے کے بعد اگر نظم پڑھی جائے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے بلحاظ زبان و بیان نیرؔ صاحب میں پختگی ہے۔"

○ ماہنامہ "مسلمہ" لاہور

"شعر و حکمۃ" کے ابتدائی صفحات میں حکیم صاحب نے اپنے شاعرانہ ذوق کی تدریجی نشو و نما کی دلکش کہانی بیان کی ہے جو فاری کو نصف صدی کی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکات کی جھلک دکھاتی ہے اور اس کے بعد جو دلکش اور حسین نظمیں اور غزلیں درج ہیں وہ تمام تر ایک بلند پایہ شاعر کے نکھرے ہوئے ذوق کا عکسِ جمیل ہیں۔"

○ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

"جناب حکیم نیرؔ واسطی جہاں بہت اچھے طبیب اور ماہر فن معالج ہیں وہاں بلند پایہ ادیب اور اونچے درجہ کے شاعر بھی ہیں شعر و حکمۃ ان کا دلآویز مجموعۂ کلام ہے جس کا ہر شعر ایک دلچسپ داستان ہے"

○ ہفت روزہ "تنویر" پشاور

"جناب نیرؔ واسطی پیشہ ورانہ اعتبار سے تو ایک طبیب کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن درویشانہ طبع اور شعری ذوق نے ان کی علمی دلچسپیوں کی راہ میں پیشہ ورانہ مصروفیات کو حائل نہیں ہونے دیا۔ ان کے کلام کے پورے مجموعہ میں جو نظمیں قاری کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں وہ انہوں نے "یادِ رفتگاں" اور "حکایتِ لذیذ" کے زیرِ عنوان لکھی ہیں انہیں مجموعہ کی بہترین نظمیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ دمشق، بغداد، بیروت، پیرس وغیرہ پر لکھی گئی نظمیں بھی بہت خوب ہیں۔"

○ ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

"حکیم نیرؔ واسطی کے متعلق یہ تو معلوم تھا کہ وہ نہ صرف ایک نباض طبیب ہیں بلکہ شاعر بھی ہیں اور ان کی جو نظمیں یا غزلیں وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں نکلتی رہتی ہیں اس سے ان

کے ذوقِ سخن کا علم تھا لیکن شعر و حکمۃ میں ان کی شاعری کے پورے انداز سامنے آجانے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک کامل الفن شاعر بھی ہیں۔ ان کے کلام میں خواہ وہ نظم کی صورت میں ہو یا غزل کی صنف میں، فن اپنے پورے لوازم کے ساتھ موجود ہے۔ صنائع۔ بدائع اور فنی لطافت کا اتنا اہتمام مولانا ظفر علی خاں کے بعد حکیم صاحب کے کلام ہی میں ملا۔ قاعدہ یہ ہے کہ مطالب کی باریکی عبارت کی رنگینی، شوکتِ الفاظ صحتِ محاورہ اور فنی لوازم کا اہتمام ایک جگہ جمع نہیں ہوتا یا بہت کم جمع ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے کلام میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ بلاشبہ شعر و حکمۃ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔"

○ ہفت روزہ "وفاق" لائل پور

نیرؔ واسطی ماہر فن طب کی حیثیت سے تو جانی پہچانی شخصیت ہیں ہی علم و ادب کی دنیا میں بھی بڑا ممتاز مقام رکھتے ہیں اور بلاشبہ آپ شعر و حکمۃ ہر دو میدانوں کے شہسوار ہیں۔ حکیم نیرؔ واسطی کا کلام آج کل کے ترقی پسند شاعروں کے کلام کی عریانی سے مبرا ہونے کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی نہایت بلند ہے۔"

○ پندرہ روزہ "مسیحا" بمبئی

"گیسوئے اُردو کے سنوارنے میں اطبا کسی سے پیچھے نہیں رہے ہر دور میں اردو کے چوٹی کے شعراء میں کوئی نہ کوئی طبیب نظر آئے گا جس نے ادب اردو میں لازوال شہرت حاصل کی ہے۔ حکیم نیرؔ واسطی نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے طبیب، اچھے مصنف اور ایک ممتاز محقق ہیں بلکہ ان کے تازہ مجموعہ کلام شعر و حکمۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک خوش فکر اور قادر الکلام شاعر بھی ہیں اور ان کے کلام میں پاکیزگی اور نفاست کے ساتھ بڑی پختگی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔"

○ ہفت روزہ "کوہسار" بنوں۔

"اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب و طب یا شعر و حکمۃ کا عہد قدیم سے چولی اور دامن کا ساتھ رہا ہے۔ حکیم نیرؔ واسطی جن کی طبی قابلیت کی شہرت ہند و پاکستان سے گزر کر بیرونی ممالک سے بھی دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ شعر و ادب میں بھی وہی بلند مقام رکھتے ہیں جو انہیں طب میں حاصل ہے اور آپ کی تازہ تصنیف اس پر شاہدِ عدل ہے۔"

○ "آزاد ہند" کلکتہ

شعر و حکمت مجموعۂ کلام ہے حکیم نیّر واسطی کا جو شاعرِ رومان اختر شیرانی مرحوم کے ان احباب میں سے ہیں جنہیں بجا طور پر خلوتی راز کہا جا سکتا ہے۔ نیّر واسطی لاہور کی دلنواز صبحوں اور نظر نواز شاموں کے درمیان زندگی کا اتنا طویل و نغز گزار چکے ہیں کہ ان کے ذہن و قلم پر ماحول کی جمال آفرینیوں اور سحر طرازیوں کا اثر لازمی ہے۔

شعر و حکمت میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی اور متعدد نظمیں مذہبی جذبات و عقائد کی حامل بھی ہیں لیکن ان کی تخلیقات کا وہ خصوصی وصف جو پنجاب کے رومان پرور ماحول اور شاعرِ رومان کی قربت و رفاقت کا نتیجہ ہو سکتا ہے ہر جگہ نمایاں ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے فکر و فن کی انفرادی تابناکیاں بھی پورے طور پر بے نقاب نظر آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بالغ نظری اور قدرتِ بیان کے فسوں کار توازن نے کتاب کے نام کا بھرم قائم رکھتے ہوئے شعر و حکمت کا ایسا دلکش امتزاج پیش کیا ہے جو دل و دماغ دونوں کے لیے سرمایۂ نشاط ہے۔ نیّر واسطی کے لب و لہجہ میں بڑا انکھا پن ہے۔ ایک ایسی سرور آفریں خلش کار فرما ہے جو دلِ گداز کا عطیہ ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں رندی و مستی کی جھلکیاں ضرور ہیں مگر جذبات کی طہارت و پاکیزگی نے حدِ ادب کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

○ "مدینہ" بجنور (یو۔ پی)

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ "بہ حسنِ اتفاق ہے کہ نیّر واسطی کا مطبوعہ کلام شعر و حکمت کی صورت میں میرے ہاتھوں میں ہے وہ میرے ہموطن اور ہم استاد ہیں اور ان کا مقام آج محفلِ ادب ہے اور میری جگہ بوریۂ خانقاہ۔ بایں ہمہ ان کا کلام میرے لیے سبزۂ بیگانہ نہیں جسے صرصرِ نسیاں کی نذر کر دیا جائے۔

مقدمہ شعر و حکمت میں ادب و جنوں بیک وقت دست و گریباں ہیں اور شعر و حکمت میں معنون نظمیں اور مبوّب غزلیں دریا بکوزہ ہیں۔ آپ کا یہ نعتیہ شعر ہے

جو مسیحوں کو لبھا گئی جو کلیموں کو لوٹ گئی　　　وہ عجب نسیم بہار تھی جو چلی عرب کے دیار میں

نہ معلوم کتنے دنوں تک محراب و منبر کی محفلوں کو گرمائے گا شعر و حکمت کے تمام اشعار معیاری ہیں اور بہت اچھے ہیں"

اخبارات کے تبصرے

روزنامہ "امروز" لاہور ——— "حکیم نیرؔ واسطی ایک ماہر طبیب ہی نہیں اچھے شاعر بھی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی عمومی شہرت کا سبب ان کی طبابت ہے لیکن شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی نظر سے ان کی ادبی حیثیت پوشیدہ نہیں ہے۔

ایک ناقدِ ادب کے لئے اس اعتراف کے بغیر چارہ نہیں کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ زبان و بیان اور خیال و فکر کے اعتبار سے لائقِ داد ہے۔ شعر و حکمۃ کی اشاعت اس اعتبار سے بھی خوش آئند ہے کہ یہ ایک منجھے ہوئے شاعر کو (اگرچہ تاخیر سے سہی) مشتاقانِ ادب کے وسیع تر حلقے سے روشناس کرانے کا موجب ہوگی۔ یہ مجموعۂ کلام یقیناً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔"

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

"شعر و حکمۃ حکیم نیرؔ واسطی صاحب کی کلیات کا مجموعہ ہے اور اسم با مسمیٰ۔ اس میں قومی و ملی نظمیں بھی ہیں اور رومانی شاہکار بھی۔ یہ زمانہ پروپاگنڈا کا ہے اور حکیم صاحب اپنے ادبی پروپاگنڈے کی طرف سے غافل رہے ہیں ورنہ ان کا کلام اچھے اچھے معروف شاعروں کے کلام سے بہتر نہ ہو تو ہم پختہ تو ہے۔"

روزنامہ "آفاق" لاہور

"حکیم نیرؔ واسطی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں جن بعض پیشوں کو تہذیبی زندگی سے خاص ربط رہا ہے ان میں ایک طب کا پیشہ ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسے ——— اطباء گزرے ہیں جو اپنے فن میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی زندگی میں بھی مساوی طور پر حصہ لیتے رہے ہیں اور شعر و سخن اور علمی سرگرمیوں سے ان کا مخصوص تعلق رہا ہے۔ ہمارے نیرؔ واسطی ہمارے معاشرے کی اسی قابلِ قدر روایت کی کڑی ہیں۔ وہ ایک لائق طبیب کی تو شہرت رکھتے ہی ہیں۔ ساتھ ہی شعر و سخن سے بھی ان کا عشق مشہور ہے۔ حال ہی میں "شعر و حکمۃ" کے نام سے انہوں نے اپنے کلام کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس میں ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو اجاگر ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ حکیم صاحب کی نظمیں ان کی حساس طبیعت کی غماز ہیں ——— وہ

وقتاً فوقتاً مختلف واقعات سے متاثر ہوئے ہیں جن کو انہوں نے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔"

روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ

○ "نیّر واسطی شعر وادب سے تعلق رکھنے والے حلقے میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ان کی رومانی نظمیں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں منظر کشی میں انہوں نے جو کمال پیدا کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ایک زمانہ میں ان کا کلام "عالمگیر" میں شائع ہوتا تھا تو لوگ بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔ راقم الحروف نیّر واسطی کو اسی زمانہ سے جانتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پتہ چلا کہ نیّر صاحب نہ صرف ایک کامیاب شاعر بلکہ ایک کامیاب طبیب بھی ہیں۔

نیّر صاحب کے کلام کا مجموعہ بہت پہلے شائع ہونا چاہیئے تھا مگر دیر آید درست آید کے مقولہ کے مطابق اگر اب شائع ہوا ہے تو اچھا ہی ہوا ہے کیونکہ اس میں کئی نئی چیزیں شامل ہو چکی ہیں اور نیّر صاحب اپنے پورے انداز شاعری کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔

نیّر صاحب کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامل الفن شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ "شعر و حکمت" کا مقدمہ انہوں نے نثر میں خود لکھا ہے اور اس کتاب میں زیادہ تر انہوں نے نظمیں لکھی ہیں مگر نظم ہو یا نثر دونوں شاعرانہ خوبیوں سے بھرپور ہیں۔ رومان، رنگینی اور شوخی میں نیّر واسطی کا کلام صف اوّل میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ہم اسے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ ہر اہل علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔"

○ روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی

"حکیم نیّر واسطی شعر و حکمت کی دنیا میں یکساں شہرت و عظمت رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان کی انگلیاں کسی مایوس مریض کی نبض پر ہیں تو دوسری طرف ان کی فکرِ رسا معاشرے کے دل کی دھڑکنوں کو شمار کر رہی ہے۔ ان کے اشعار اور ان کی نظمیں ان کے بھرپور مطالعہ اور گہرے تاثرات کی حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس رنگ میں اور جس اسلوب سے بھی بات

کرتے ہیں۔ ان کی بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ کہیں وہ محفلِ ادب کے لئے رنگِ تغزل پیش کرتے ہیں تو مجلس صوفیاء کے لئے وجد و حال کا سامان۔ اور ہر مقام پر اور ہر جگہ ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ مجموعہ اربابِ ذوق میں اپنا حقیقی مقام حاصل کرے گا۔"

○ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ

پروفیسر نیر واسطی حاذق طبیب ہونے کے ساتھ علم و ادب کا بھی بلند مذاق رکھتے ہیں اور پختہ کار اہل قلم اور شاعر بھی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "شعر و حکمت" صحیح معنی میں اسم با مسمیٰ ہے ان کے کلام میں اقبال کی دانائی و سوز۔ ظفر علی خاں کے کلام کا شکوہ اور اختر شیرانی کی رومانیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ہند و پاک کے ممتاز علماء و صلحاء کی صحبتیں بھی اٹھائی ہیں اور خود ان کی طبیعت میں بھی سوز و درد مندی ہے اس لئے اس کا اثر ان کے کلام میں بھی ہے۔ ان کی طبیعت کا رنگ سطحی رومانیت سے بلند ہے جس پر ان کا کلام شاہد ہے اور مختلف اصنافِ سخن میں ان کی قادر الکلامی اور حسنِ مذاق نمایاں ہے۔ مجموعہ کے شروع میں ایک دلچسپ مقدمہ ہے جو بجائے خود تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

کتبہ محمد اعظم تلمیذ خطاطِ مشرق خلیفہ عبدالمجید پرویں رقم لاہوری